نسلِ سوختہ

اے اشرف

ضابطہ

ISBN: **978-1-4507-2901-7**

کتاب : نسل سوختہ

مصنف : کے اشرف

سرورق : چارلس کینٹز

مطبع : سی ڈبلیو پرنٹرز

قیمت : 20یو ایس ڈالرز

سی ڈبلیو پرنٹرز، 1375 یونیورسٹی ایونیو، برکلے، کیلیفورنیا، یو ایس اے

انتساب

پاکستان کے عوام کے نام

اظہار تشکر

نسل سوختہ کئی اقساط میں لکھی گئی اور تکمیل کے مراحل تک پہنچی۔ اس کی ہر قسط باقاعدگی کے ساتھ رائٹرز فورم اور کولیشن فار ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی کے ممبران کی خاطر طبع کے لیے پیش کی گئی۔

دونوں فورمز کے کئی ممبران نے ہر قسط کے بعد اپنے تاثرات کا ای میل کے ذریعے اظہار کیا۔ کئی ایک نے مفید مشورے دیئے جن کے لیے میں ان سب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

خاص طور پر محترم سید محسن نقوی، نجم الحسن اور اعجاز سید نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا جس کے لیے میں ان کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں۔

ان محترم دوستوں کے علاوہ میں رائٹرز فورم اور سی آر ڈی پی کے ماڈریٹرز جناب محترم منیر سامی اور جناب ڈاکٹر محمد تقی اور ڈاکٹر ناصر گوندل کا مشکور ہوں جن کی اجازت اور عنایت سے نسل سوختہ مرحلہ وار ان کی لسٹوں کے ممبران تک پہنچی۔

آخر میں ان دونوں لسٹوں کے سب ممبران کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری اس کوشش میں میری ہمت افزائی کی۔

حرفِ اول

1947 میں ہندوستان تقسیم ہوا تو ہندوستانی اور پاکستانی کہانی نگار کئی دہائیوں تک تقسیم کے پس منظر میں کہانیاں لکھتے رہے۔ ایک لحاظ سے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

تقسیم ہندوستان کے بعد 1971 میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو اس نے پاکستانی لکھنے والوں کو ایک نیا موضوع دیا۔

اس حوالے سے کئی کہانیاں اور ڈرامے تخلیق ہوے۔ کئی ادبی و تحقیقی کتابیں لکھی گئیں جن میں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے تکلیف دہ عمل کا مختلف زاویوں سے جائزہ پیش کیا گیا۔ کئی فوجی افسران نے آنکھوں دیکھا حال کے طور پر ان تفاصیل پر مبنی کتب لکھیں جن میں حکومتی اور فوجی نقطہ ہائے نظر سے واقعات کی تصویر کشی کی گئی۔

جس وقت پاکستان تخلیق کے مراحل سے گزر رہا تھا اس وقت تین مختلف نسلیں اس تخلیقی عمل سے گزر رہی تھیں۔

ایک وہ نسل تھی جو ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ ان کا جذباتی پس منظر ہر لحاظ سے ہندوستانی تھا۔ لیکن انہوں نے نہ صرف شعوری طور پر پاکستان کی تخلیق کو خوش دلی سے قبول کیا بلکہ اسے عملی حقیقت بنانے میں قائداعظم کی راہنمائی میں بھرپور کردار ادا کیا۔

دوسری وہ نسل تھی جو پیدا تو ہندوستان میں ہوئی تھی لیکن ابھی سنِ شعور کو نہیں پہنچی تھی۔ ان کا شعور پاکستان کے ابھرنے والے سورج کی قبل از طلوع کرنوں کی ہلکی ہلکی حدت محسوس کر رہا تھا۔ ان میں سے کئی لڑکے اور لڑکیاں ابھی پرائمری اور ہائی سکولوں یا کالجوں کے ابتدائی تعلیمی مراحل میں تھے۔ ان کا قائداعظم اور پاکستان کے ساتھ رشتہ اس نسل سے مختلف تھا جو پہلے سے جوانی یا بڑھاپے تک پہنچ چکی

تھی اور پورے جذباتی، سیاسی، سماجی اور معاشی شعور کے ساتھ پاکستان کی تخلیق میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔

تیسری نسل وہ تھی جو پاکستان کے ساتھ یا پاکستان بننے کے بعد پہلی دہائی میں پیدا ہوئی۔ اس نسل نے شعوری طور پر قائد اعظم کی کرشمہ ساز قیادت سے براہ راست راہنمائی حاصل نہیں کی تھی لیکن بانی پاکستان ہونے کی وجہ سے قائد اعظم کی شخصیت کا سحر اس نسل میں موجود تھا۔ اس نسل کے ذہنوں میں ہندوستانی ہونے کے شعور کی بجائے پاکستانی ہونے کا شعور مکمل طور پر مرتسم ہو چکا تھا۔ اس شعور کے ساتھ پاکستان میں پروان چڑھتے اس نسل نے جس طرح پاکستان میں سیاسی، سماجی اور معاشی اتار چڑھاؤ کا تجربہ کیا، نسل سوختہ اسی کی کہانی ہے۔

پاکستان کی تخلیق سے لے کر بنگلہ دیش کی تخلیق تک پاکستان میں جس طرح ادارے بنے، ٹوٹے، جس طرح مارشل لا لگے، جس طرح سیاسی کھیل کھیلے گئے اور جس طرح اس نسل نے ان حالات و واقعات کو جھیلا، نسل سوختہ اس کی تصویر کشی کی ایک کوشش ہے۔ نسل سوختہ میں کئی نام حقیقی ہیں لیکن ان کا کردار فرضی ہے۔ کئی نام فرضی ہیں لیکن ان کا کردار حقیقی ہے۔

امید ہے قارین کو یہ کاوش پسند آئے گی۔

کے-اشرف
1375 یونیورسٹی ایونیو
برکلے، کیلیفورنیا 94702
یو ایس اے
Email: kashraf@ix.netcom.com

23 مارچ 2010

فصل 1

علی پہلے دن کالج پہنچا تو اسے زندگی میں نئے پن کا احساس ہوا۔ چڑھتے دن کی دھوپ کے ساتھ اسے ہر چیز چمکدار اور روشن دکھائی دی۔ پرائمری اور ہائی سکول کے دن اسے خواب محسوس ہوئے۔ ایسے خواب جو کالج کی عمارت میں داخل ہوتے ہی کھلونوں کی طرح ٹوٹ گئے۔ کئی چیزیں جن کے لیے وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا تھا بے معنی ہو گئیں۔

اسے اپنے اندر اعتماد کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی جس میں زندگی کے رنگ اسے دھوپ میں چمکتی آبشار کی طرح کھلتے اور اچھلتے دکھائی دیئے۔ اسے اپنی چال میں بھی ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔

اسے یاد تھا ہائی سکول جاتے ہوئے وہ بھاری بھرکم کتابوں کا بیگ کندھے پر لٹکائے، سر جھکائے، بے خیالی میں سکول پہنچ جاتا تھا اور پھر سارا دن ایک کے بعد دوسرے استاد کی جماعت میں بیٹھنے کے بعد جب سکول سے نکلتا تو کتابوں کا بھاری بیگ کچھ اور بھی بھاری ہو جاتا تھا۔

سکول سے گھر تک چند فرلانگ کے فاصلے کی طوالت کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔

سکول سے نکلنے کے بعد اس کے دل میں طمانیت کا پہلا جھونکا اس وقت آتا تھا جب وہ اپنے گھر کے دروازے کی دہلیز کے اندر قدم رکھتا اور اسے ماں کی چمکارتی آواز سنائی دیتی۔

"علی بیٹا سکول سے لوٹ آئے ہو۔"

اور وہ کتابوں کا بیگ ایک طرف پھینک کر بھاگتے ہوئے ماں سے لپٹ جاتا۔

ماں پیار سے اس کا منہ چومتی۔ پینے کے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس دیتی۔ جسے پی کر اس کی سارے دن کی تھکن یوں رفو چکر ہو جاتی جیسے وہ سکول جانے کی بجائے سارا دن ماں کے آس پاس اپنے کھلونوں سے کھیلتا رہا ہو۔

لیکن آج جب وہ کالج کی عمارت میں داخل ہو رہا تھا نہ تو اس کے کندھوں پر کتابوں کا بھاری بھر کم بیگ تھا، نہ اس کا سر جھکا ہوا تھا، نہ کندھے لٹکے ہوئے تھے، اور نہ ہی وہ بے خیالی تھی۔ بلکہ زندگی کو دیکھنے، برتنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کا ایک حوصلہ تھا جس میں اعتماد بجلی کے کرنٹ کی طرح بھرا تھا جو کسی بھی چیز کو چھوتے ہی مٹا ڈالنے کی طاقت رکھتا تھا۔

ہائی سکول کے استادوں کے برعکس کالج کے استاد بھی مختلف تھے۔ ان کے رویئے میں استاد کی بجائے دوستی کا عنصر زیادہ غالب تھا۔ ان کا پڑھانے کا انداز بھی سکول کے ماسٹروں کی طرح یک طرفہ نہیں تھا۔ پڑھائی کے عمل میں وہ طالب علموں کو اس طرح شامل کرتے جیسے وہ سب ایک ساتھ کسی نئے شہر میں وارد ہوئے ہوں اور مل کر اس شہر کی دریافت کے عمل سے گزر رہے ہوں۔

علی کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ دن بھر کی علمی مصروفیات سے تھکنے کی بجائے اس دن جب وہ ترو تازہ گھر لوٹا تو ماں کی چمکارتی آواز "علی بیٹا کالج سے لوٹ آئے ہو" کی نرماہٹ یونہی قائم تھی لیکن ہاتھ میں پکڑی چند کتابیں فرش پر پھینک کر ماں کی طرف بھاگنے کی بجائے اس نے اطمینان سے کتابیں اپنی الماری میں رکھیں اور پھر ماں کی طرف لوٹ کر اس کی پیشانی پر ادب اور پیار سے بوسہ دیا۔ جواب میں ماں نے بھی علی کا منہ چوما اور لمبی عمر کی دعائیں دیں۔

علی چوہدری حسین کا اکیلا بیٹا تھا۔ چوہدری حسین گاؤں کے نمبر دار تھے۔ گاؤں کے دائیں طرف کئی سو مربع رقبہ ان کی ملکیت تھا۔ زرخیز زمین تھی۔ بارشیں ہمیشہ وقت پر ہوتی تھیں۔ ویسے بھی پانی وافر مقدار میں میسر تھا۔ اس لیے فصلیں خوب ہوتی تھیں۔ دھان، مکئی اور گنے کی فصلیں سارا سال چوہدری حسین کو کاشت کاری کے عمل میں مصروف رکھتیں۔

اگرچہ چوہدری حسین جدید خیالات اور زرعی ٹیکنالوجی کے بھرپور استعمال اور بہت سے زرعی مزدوروں کی مدد سے یہ سارا کاروبار بہت آسانی سے چلا رہے تھے لیکن بڑھتی ہوئی عمر نے ان کے جسم پر اپنے

اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ علی ان کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے جلدی سے اپنے تعلیمی مراحل طے کرے اور کھیت کھلیان سنبھالے۔

علی بھی ہائی اسکول کے زمانے سے کبھی کبھار اپنے والد چوہدری حسین کے کھیتی باڑی کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کا عادی تھا لیکن کالج کی آزاد فضاؤں اور شہری ماحول سے علی کے اندر ایک نیا شعور انگڑائیاں لے رہا تھا۔ زندگی کے نئے خدوخال اس پر عیاں ہو رہے تھے۔ اسے اپنے والد چوہدری حسین کی کھیتی باڑی کے علاوہ زندگی کے اور کئی نئے رنگ وروپ دکھائی دینے لگے تھے۔

ہائی سکول کے آخری دن ہیڈ ماسٹر قاضی صاحب نے رندھی ہوئی آواز کے ساتھ نپے تلے الفاظ اور پدرانہ لہجے میں انہیں مختصراً آئندہ زندگی کے اسرار ورموز سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن علی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی بظاہر چھوٹی سی دنیا حقیقت میں اتنی بڑی ہے کہ وہ ساری عمر اس میں ابھرنے والے سرابوں کا تعاقب کرتا رہے تو بھی اس دنیا کے تہہ در تہہ اسرار اس کی گرفت سے باہر رہیں گے۔

سب سے پہلے کالج کے ابتدائی چند مہینوں میں علی کی اپنے اندر چھپے ایک ایسے مرد سے شناسائی ہوئی جسے زندگی ایک خوبصورت گھوڑے کی طرح لگی۔ وہ چھلانگ لگا کر اس گھوڑے پر سوار ہو کر دور بہت دور ان دیکھی منزلوں کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ ایسی منزلوں کی طرف جہاں چوہدری حسین کے کھیت تھے، نہ بڑا سا حویلی نما گھر، اور نہ گاؤں کی گلیاں کوچے۔ بس ایک لامحدود اُفق سے اُفق تک پھیلی دنیا تھی اور زندگی کا بگٹٹ بھاگتا گھوڑا۔ اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کے ساتھ ڈوبتے اور اُبھرتے منظر۔

علی پر اس احساس سے ایسی سرشاری طاری ہوئی کہ اب اس پر سکول والے دنوں کی بے خیالی کی جگہ سارا وقت نئے خیالوں کی بارش ہونے لگی۔ جو بھی علی سے ملتا اسے ان تازہ خیالات کے عکس واضح طور پر اس کی آنکھوں میں تیرتے دکھائی دیتے۔

سوچ کے اس انوکھے انداز سے اس کی شخصیت میں ایسی دلکشی پیدا ہوئی کہ اس کے سب استاد اور ہم جماعت اس کی طرف کھنچنے لگے۔ اس طرح اس کے گرد ایک ایسا حلقہ ٔ احباب پیدا ہوا جن کے التفات سے اس پر زندگی کی نئی جہتیں روشن ہونے لگیں۔ زندگی کی ان نئی جہتوں کے کھلتے رنگوں کے ساتھ علی اپنے مربی باپ اور مہرباں ماں سے دور سے دور تر ہوتا چلا گیا۔

زندگی کے پھیلتے ہوئے دائروں کے سبب ایک دن کالج سے واپسی پر علی نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ اب اس کے لیے ہر روز کالج سے گھر آنا ممکن نہیں۔ پڑھائی کے سلسلے میں اب اسے کالج کے ہوسٹل میں رہنا ہو گا۔ اوراب وہ صرف چھٹی کے دن گھر آیا کرے گا۔

ماں پر علی کی یہ جملے بجلی بن کر گرے۔ وہ چند لمحوں تک حیرت سے پھیلتی اور سکڑتی آنکھوں کے ساتھ علی کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ علی کی اس بات پر کس طرح رد عمل ظاہر کرے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کالج گھر سے اتنا دور تو نہیں تھا۔ علی روزانہ بس پکڑ کر آدھ گھنٹے میں گھر سے کالج اور کالج سے گھر آجا سکتا تھا۔ ویسے بھی اللہ کا دیا سب کچھ تھا وہ چاہتا تو چوہدری حسین علی کے لیے بہ آسانی موٹر سائیکل یا کار خرید سکتے تھے۔

آج تک انہوں نے کبھی گاڑی خریدنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ان کے رقبے کی حدود گھر کے دروازے سے شروع ہو جاتی تھیں۔ زمین پر آنے جانے کے لیے کئی گھوڑیاں اور گھوڑے موجود تھے۔ جن سے ان کی زندگی باآسانی چل رہی تھی۔

اس دن چوہدری حسین گھر آئے تو ماں نے نم آنکھوں اور دکھی دل کے ساتھ علی کے کالج کے ہاسٹل میں منتقل ہونے کی خبر سنائی۔

چوہدری حسین پر علی کے اس فیصلے کا اثر ماں سے بھی زیادہ سخت ہوا۔ ماں تو خون کی آنسو پی کر بیٹے کی محبت میں خاموش رہی لیکن چوہدری حسین تھکے اعصاب کے ساتھ یہ خبر سن کر مسہری پر لیٹ گئے اور واویلا کرنے لگے۔ انہیں لگا زندگی کچھ مزید بوجھل ہو گئی ہے۔

علی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کئی پشتوں سے ان کے خاندان میں اکلوتے بیٹوں کی پیدائش کا سلسلہ چل رہا تھا۔ چوہدری حسین اپنے باپ چوہدری احمد علی کے اکلوتے بیٹے تھے اور چوہدری احمد علی اپنے باپ چوہدری محمد علی کی اکلوتی اولاد تھے۔ چوہدری محمد علی اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ سب نے اپنے اپنے وقت میں کالج میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن ان میں سے کبھی کسی نے ہاسٹل میں رہنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

بسیں چلنے سے پہلے سب گھوڑے پر کالج جاتے آتے رہے۔ جب چوہدری حسین نے کالج جانا شروع کیا تو گاؤں سے شہر تک سڑک بنی اور بسیں چلنا شروع ہو گئیں۔ چوہدری حسین جب تک کالج میں زیر تعلیم رہے ہمیشہ بس پر کالج آتے جاتے رہے۔

علی کے ہاسٹل میں منتقل ہونے کی خبر سن کر انہیں وہ روایت ٹوٹتی نظر آئی جو باپ دادا سے چلی آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں نسل در نسل منتقل ہوتا زمینداری کا سلسلہ بھی منقطع ہوتا نظر آیا۔ علی ان کا اور ان کے آباؤ اجداد کا اکیلا وارث تھا۔ انہیں خوف تھا کہ وہ ہاسٹل میں رہا تو نہ جانے اس کے خیالات میں کیا تبدیلی رونما ہو اور پشت در پشت چلتا یہ سسلسلہ ختم ہو جائے۔

چوہدری حسین کا واویلا سن کر علی نے ماں اور باپ کو تسلی دی کہ چند برسوں میں اس کی تعلیم مکمل ہو جائے گی تو وہ سب کام کاج سنبھال لے گا۔ اس نے انہیں اپنے ان سب دوستوں کے بارے میں بتایا جن کے ساتھ مل کر وہ بہتر انداز میں اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے۔

دوستوں کے ذکر سے چوہدری حسین اور بھی متفکر ہوئے اور انہوں نے علی کو گاڑی خریدنے کی پیشکش کی اور یہ بھی کہا کہ اس کے دوست جب چاہیں اس کے ساتھ گھر یا زمینوں پر آسکتے ہیں۔

لیکن علی کے خیالات خاندانی روایتوں سے آزاد کسی اور دنیا کے خوابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ زندگی کے گھوڑے کو اتنی تیزی سے ایسی سرزمینوں کی طرف بھگانا چاہتا تھا جس کی پرچھائیاں ابھی صرف اس

کے ذہن میں تھیں۔ انہی خیالات میں گم، اس نے ماں کی پیشانی پر پیار سے بوسہ دیا، باپ کے قدموں کو
ادب سے چھوا، اور پھر اپنی کتابیں اور چند کپڑے اٹھا کر گھر سے رخصت ہو گیا۔

فصل 2

علی گھر سے رخصت ہو کر کالج کے ہاسٹل پہنچا تو اس کے دوستوں نے اس کی ہاسٹل منتقلی کا جشن منانے کا اعلان کر دیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی جس کے ذمہ جشن کے انتظامات کی جُزئیات کا خیال رکھنا تھا۔

پرنسپل سے اجازت لیکر جشن میں موسیقی فراہم کرنے کے لیے شہر کے مشہور میوزک بینڈ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ شہر کے سب سے بڑے اور معروف ہوٹل کو کیٹرنگ کے لیے کہا گیا۔ کالج کے تمام اساتذہ کو جشن میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ ہر استاد نے یہ دعوت بصد شکریہ قبول کی اور جشن میں شامل ہونے کا وعدہ کیا۔

جشن کے لیے ہفتے کی شام کے وقت کا تعین کیا گیا تا کہ تمام اساتذہ اور طالب علم اگلے دن کالج میں اتوار کی چھٹی کی وجہ سے رات دیر تک بھرپور انداز میں جشن منا سکیں۔ جشن کے لیے ہاسٹل کے پائیں باغ کا انتخاب کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ رات کے وقت رات کی رانی کی ہلکی ہلکی خوشبو جشن میں شامل ذہنوں کو معطر کرتی رہے اور وہ اچھی خوراک اور خوبصورت میوزک کے علاوہ فطرت کی کرشمہ سازیوں سے بھی لطف اندوز ہو سکیں۔

جشن کے لیے قائم کی گئی کمیٹی کے ارکان نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اگر کالج کے تمام اساتذہ اور طالب علم جشن میں شامل ہو رہے ہیں تو مناسب ہو گا کہ چیدہ چیدہ معززین شہر کو بھی جشن میں شمولیت کی باقاعدہ دعوت دی جائے۔ ان کی شمولیت سے جشن محض طالب علموں کے ایک فنکشن کی بجائے پوری کمیونٹی کے فنکشن میں بدل جائے گا۔ اس سے کالج کی ساکھ میں اضافہ ہو گا اور طالب علموں کے لوکل کمیونٹی کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

یہی سوچ کر علی کے دوستوں کی کمیٹی نے شہر کے میئر، سٹی کونسل کے ممبران، اور تمام جانے پہچانے کاروباری حضرات کو بھی جشن میں شمولیت کی دعوت دے ڈالی۔

کمیٹی ممبران اور علی اس وقت حیران رہ گئے جب نہ صرف میئر اور سٹی کونسل کے ممبران بلکہ بہت سے سرکردہ کاروباری حضرات نے بھی جشن میں شمولیت کی دعوت قبول کرلی۔

ہفتے کے دن کا سورج آخری کرنیں بکھیرتا شہر کے مغربی کنارے پر روپوش ہوا تو کالج کے پائیں باغ میں سجائے گئے بجلی کے شمعدان جل اٹھے۔ درختوں کے پتوں میں جھلملاتی روشنیوں نے سارے ماحول کو چار چاند لگا دیئے۔

کسی بھی طالب علم کا تعلیم کے لیے گھر سے کالج کے ہاسٹل منتقل ہونا کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کے لیے اس طرح کا جشن منایا جاتا۔ لیکن علاقے کے سرکردہ زمین دار چوہدری حسین کے بیٹے علی کا گھر چھوڑ کر ہاسٹل منتقل ہونا یقیناً ایک بڑی بات تھی۔ اس لیے سب معززین شہر کی اس جشن میں شمولیت قابل فہم تھی۔ چوہدری حسین اگرچہ گاؤں میں نسبتاً الگ تھلگ زندگی گزارتے تھے لیکن علاقے میں ان کا بہت اثر ورسوخ تھا اور سبھی انہیں جانتے تھے۔

علاقے میں یہ اثر ورسوخ پیدا کرنے میں چوہدری حسین کا عمل دخل کم لیکن کے ان کے والد چوہدری احمد علی کے بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ ذاتی مراسم کا زیادہ تھا۔ قائداعظم جب بھی اس علاقے میں تشریف لاتے ہمیشہ چوہدری احمد علی کے گھر قیام کرتے۔ جب تک قائداعظم وہاں ٹھہرتے چوہدری احمد علی کا گھر سارے علاقے کے معززین کی آماج گاہ بنا رہتا۔ علاقے کی ساری انتظامیہ، مسلم لیگی، اور کانگرسی لیڈر قائداعظم سے ملنے چلے آتے۔

چوہدری حسین اپنے والد چوہدری احمد علی سے الگ مزاج رکھتے تھے۔ انہیں سیاسی سرگرمیوں سے بہت کم دلچسپی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ساری توجہ زمینوں کی دیکھ بھال پر مرکوز کر رکھی

تھی۔ لیکن گھر پر قائد اعظم کے قیام کی وجہ سے ان سے ملنے آنے والے انتظامیہ کے ارکان، مسلم لیگی اور کانگرسی لیڈروں سے ان کی خاصی جان پہچان تھی۔

اسی خاندانی اثر ورسوخ کی وجہ سے گھر سے ہاسٹل منتقل ہونا اور پھر ہاسٹل میں آمد کی خوشی میں علی کے دوستوں کی طرف سے منعقد کئے جانے والے جشن میں سب معززین شہر کا کھنچے چلے آنا سمجھ آتا تھا۔

باغ میں بجلی کے قمقمے روشن ہوتے ہی میوزک کے بینڈ نے ایک کونے میں سجے اپنے ڈائس سے ہلکی پھلکی موسیقی کی دُھنیں بکھیرنا شروع کیں تو جشن کا سماں بندھنا شروع ہوا۔ علی اور اس کے دوست ہر آنے والے کو مسکراتے چہروں کے ساتھ خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ معززین شہر کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔

خاص طور پر شہر کے میئر خواجہ احسن جب جشن میں شمولیت کے لیے پائیں باغ پہنچے تو جشن میں شامل حاضرین کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ کالج کے اسٹاف، علی اور اس کے دوستوں نے آگے بڑھ کر میئر کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے تو موسیقاروں نے موسیقی کی دھنیں تیز کر دیں۔

میئر شہر ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے لوگوں سے ہاتھ ملاتے سٹی کونسل اور معززین شہر کے لیے مخصوص نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

میئر کی آمد کے چند ثانیوں بعد علی نے ڈائس پر جا کر جشن کے باقاعدہ آغاز کا اعلان کرتے ہوئے کہا:

"دوستو اور ساتھیو آج کی شام میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش بخت ترین انسان سمجھتا ہوں۔ میری اس خوش بختی کا سبب اس جشن میں آپ کی تشریف آوری اور شرکت ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ میرا گھر سے ہاسٹل منتقل ہونا اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس پر جشن منایا جاتا۔ لیکن کالج کے ہاسٹل میں رہائش پذیر دوستوں کا اصرار تھا کہ میں تعلیم کی تکمیل تک ان کے ساتھ ہاسٹل میں قیام کروں۔ میرے والدین میرے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے لیکن اپنے دوستوں کے اصرار پر میں نے اپنا باقی تعلیمی وقت ہاسٹل میں بتانے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ جشن صرف ایک بہانہ ہے آپ سب معززین سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ کو آج کی رات بجلی کے قمقموں سے سجے اس باغ کا ماحول، شہر کے بہترین موسیقی کے بینڈ کا میوزک اور روز ہوٹل کی تیار کردہ خوراک پسند آئے گی۔

اس سے پہلے کہ ہم خوراک اور موسیقی سے لطف اندوز ہونا شروع کریں میں میئرِ شہر جناب خواجہ احسن صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ڈائس پر آکر آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔"

میئرِ شہر علی کی درخواست پر آہستہ آہستہ چلتے ڈائس تک پہنچے اور پھر علی سے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوے ان الفاظ میں حاضرینِ جشن سے مخاطب ہوئے۔

"معززین شہر، جناب پرنسپل، محترم اساتذہ، اور عزیز طالب علمو۔ میں آپ سب کا تہہِ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اس جشن میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

اس جشن میں شامل ہونا میرا فرض تھا۔ عزیزم علی حسین کے خاندان کے ساتھ عرصہ دراز سے ہمارے خاندانی مراسم چلے آرہے ہیں۔ علی کے دادا چوہدری احمد علی میرے والد مرحوم کے بہت قریبی دوست تھے۔ چوہدری احمد علی اور میرے والد مرحوم دونوں قائد اعظم کی تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن تھے۔ دونوں پر قائد اعظم کو بہت اعتماد تھا۔ اور وہ پنجاب کے لیگی معاملات میں چوہدری احمد علی اور میرے والد مرحوم کی رائے کو ہمیشہ اہمیت دیتے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ اب قائد اعظم، چوہدری احمد علی اور میرے والد مرحوم جیسے راہنما ہماری راہنمائی کے لیے ہم میں موجود نہیں۔ ان حالات میں جبکہ ملک ابھی اپنا آئین نہیں بنا پایا، گورننس کے مسائل دن بدن پیچیدہ ہونا شروع ہو گئے ہیں، ہمیں ان عظیم راہنماوں کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن تقدیر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔

ہمارے محبوب قائد اب ہم میں نہیں رہے۔ لیکن امید کی چند کرنیں اب بھی باقی ہیں۔ ایک تو آئین ساز اسمبلی آئین بنانے کے قریب پہنچ چکی ہے۔ جیسے ہی آئین بن جائے گا ہماری قومی زندگی ایک دھارے پر آجائے گی۔

دوسرا آپ جیسے طالب علموں کا بے پناہ اعتماد کہ پاکستان کو ہر صورت میں دنیا کا ایک عظیم ملک بنانا ہے اور اس مقصد کے لیے آپ کی جدوجہد۔

علی کا گھر سے ہاسٹل میں منتقل ہونا اگرچہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن اس معمولی واقعہ کو ایک جشن میں تبدیل کر کے آپ نے پاکستان کے نوجوانوں میں میرے یقین اور اعتماد کو پختہ تر کر دیا ہے۔

جب تک آپ جیسے زندگی سے بھرپور نوجوان پاکستان کے قافلے میں شامل ہیں مجھے کامل یقین ہے کہ اس ملک کو بلندیوں کی منزل تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس شاندار جشن میں شرکت کی دعوت دی، میری اتنی پذیرائی کی اور مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع عنایت کیا۔"

میئر شہر کی تقریر ختم ہوئی تو موسیقی کے بینڈ نے رجزیہ دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ روز ہوٹل کے باوردی بیروں نے حاظرین کے سامنے خوبصورت قابوں میں گرما گرم غذا سجا دی۔ موسیقی کی دلآویز دھنوں کے ساتھ حاظرین جشن نے خوراک کھانی شروع کی۔

ایسے میں سارا باغ کھانے کے دوران علی کے دوستوں کی خوش گپیوں سے چہک اور رات کی رانی کی خوشبو سے مہک اٹھا۔

فصل 3

علی کے گھر میں علی کے علاوہ اس کے ماں باپ تھے یا گھریلو کام کاج کرنے والے نوکر اور نوکرانیاں۔
ہاسٹل میں ڈیڑھ دو سو کے قریب طالب علم مقیم تھے۔ جن میں سے اکثر کے ساتھ علی کی دوستی ہو چکی تھی۔ کچھ اس کے زیادہ قریب تھے کچھ کم، لیکن اس کی جان پہچان سب سے تھی۔
جو اس کے زیادہ قریب تھے ان کے بارے میں اسے زیادہ معلومات حاصل تھیں لیکن جو کم قریب تھے ان کے ناموں اور دلچسپیوں کا بھی اسے خوب اندازہ تھا۔
اس کے قریب ترین ساتھیوں میں سر فہرست اظہر تھا۔ اظہر کا والد پاکستان آرمی میں میجر تھا۔ کئی سال قبل کسی ان جانی بیماری سے میجر صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اظہر کے دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ ایک بھائی بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ بہن اظہر سے چھوٹی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد اظہر کا بڑا بھائی بھی آرمی کے اسپیشل کوٹے میں فوج میں بھرتی ہو چکا تھا اور تیزی کے ساتھ ترقی کرتا میجر کے رینک تک پہنچ چکا تھا۔
والد کی وفات کے بعد خاندان کی کفالت کی ذمہ داری اظہر کے بڑے بھائی میجر احمد کے کندھوں پر تھی۔ لیکن میجر احمد کی تنخواہ خاندان کی آمدن کا واحد ذریعہ نہیں تھا۔
کچھ آمدن انہیں ان زمینوں سے بھی ہو جاتی تھی جو ملٹری نے کفالت کے لیے میجر صاحب کی وفات کے بعد انہیں الاٹ کی تھیں۔
اظہر گاہے بگاہے ان زمینوں پر چکر لگاتا تا کہ دیکھ سکے کہ جن لوگوں کو اس نے زمین ٹھیکے پر دے رکھی ہے وہ وقت پر فصلوں کی بوائی اور کٹائی کرتے ہیں یا نہیں۔
اظہر کا چھوٹا بھائی اور بہن ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ اور گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ اظہر اکثر چھٹی کے دن اپنے گھر چلا جاتا لیکن علی زیادہ تر ہاسٹل میں ٹکا رہتا۔ لیکن اظہر جتنے دن ہاسٹل میں

ہوتا اس کا زیادہ تر وقت علی اور اس کے دوستوں کی معیت میں گزرتا۔ اکٹھے کالج جانا، شہر کی سڑکوں پر آوارگی کرنا، آتی جاتی لڑکیوں پر آوازے کسنا، مختلف کلبوں کے چکر لگانا، اور رات کو دیر تک ہاسٹل میں کسی دوست کے کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ کرنا ان کے روزوشب کا معمول تھا۔ کبھی کبھار اگر کوئی اچھی فلم ریلیز ہوتی تو چند اور دوستوں کے ساتھ مل کر فلم دیکھنے جانا بھی ان کے معمولات میں شامل تھا۔

جب کبھی دوستوں کا جمگھٹا چھٹتا علی اور اظہر میں گفتگو چل نکلتی۔ مختلف موضوعات زیر بحث آتے۔ کبھی دوستوں کی باتیں ہوتیں۔ کبھی فلموں کی۔ کبھی سیاست کی اور کبھی روزمرہ کے معاملات کی۔ ایسے میں اظہر زمینداری کے مسائل کا ذکر کرتا تو علی اس پر تعجب کا اظہار کرتا۔ وہ اس سے کہتا:

"ہم بھی زمین دار ہیں لیکن ہمیں کبھی ان مسائل کا سامنا نہیں رہا۔ ہماری زمینوں پر بھی کھیت مزدور کام کرتے ہیں لیکن کبھی کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ سب بڑے چوہدری صاحب کو مائی باپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔"

علی جب بھی اپنے والد چوہدری حسین کا ذکر کرتا تو انہیں بڑے چوہدری صاحب کہہ کر ان کی بات کرتا۔

"تمہاری زمین داری کی بات اور ہے۔ سچ پوچھو تو آپ لوگ زمین دار نہیں جاگیر دار ہیں۔ گاؤں کے اکثر لوگ آپ کے کھیتوں پر کام کرتے ہیں۔ ان کے سال بھر کا دانہ آپ کے کھیتوں سے آتا ہے۔ اس لیے وہ بڑے چوہدری صاحب کو مائی باپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن میجر صاحب کی بیماری میں سرکار نے انہیں عیال داری کے لیے ایک مربع زمین الاٹ کی تھی۔ جو ہم نے مزارعین کو ٹھیکے پر دے رکھی ہے۔ مزارعین کبھی ٹھیکے کی رقم ادا کرتے ہیں کبھی نہیں۔ کبھی باڑ کا بہانہ کبھی بیج کے ناقص ہونے کا رونا۔ وہ تو شکر ہے بھائی جان کو ایف اے کرتے ہی فوج کے اسپیشل کوٹے میں کمشن مل گیا اور وہ شارٹ کورس کے ذریعے جلد ہی لفٹین اور پھر کپتان ہو گئے تو گھر کا سلسلہ چلتا رہا۔ ورنہ میجر صاحب کی بے وقت موت نے ہمارا بھرکس نکال دیا تھا۔"

علی اظہر کی بات سن کر اس کو ہمیشہ زندگی کی بڑی تصویر دیکھنے کا مشورہ دیتا۔ انسانی مسائل کو بڑے تناظر میں ڈال کر دیکھنے کی بات کرتا۔

اظہر کو علی کی بات کچھ سمجھ میں آتی کچھ نہ آتی۔ بڑی تصویر، بڑا تناظر اس کے لیے انوکھے الفاظ تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ علی جب بڑی تصویر یا بڑے تناظر کی بات کرتا ہے تو اس سے اس کی کیا مراد ہوتی ہے۔

دراصل علی کی اسی طرح کی باتیں اس کے دوستوں میں دن بدن اضافے کا سبب بن رہی تھیں۔ علی کا اس طرح کا انداز فکر اور طرز استدلال علی کے اساتذہ کو بھی متاثر کرتا۔ وہ اکثر علی سے گفتگو کر کے خوشی محسوس کرتے۔ انہیں اس نوجوان میں ایک عجیب سی شخصی اور فکری کشش محسوس ہوتی۔

علی ادھ کھلے پھول کی طرح ہر ملنے والے کو اپنی خوشبو سے اس طرح مسحور کر دیتا کہ وہ سب اس کے ساتھ مل کر پوری دنیا میں بکھر جانے اور دنیا کو معطر کر دینے کے خواب دیکھنے لگتے۔

کالج کا ہاسٹل اس طرح کی گفتگو اور ایسی محفلیں سجانے کے لیے مناسب ترین جگہ تھی۔ ہاسٹل منتقل ہونے کے بعد شروع میں وہ کبھی کبھار گاؤں چلا جاتا اور ماں باپ سے مل آتا۔ کبھی خود چوہدری حسین صاحب ہاسٹل چلے آتے اور علی سے مل جاتے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کا گھر جانا کم سے کم ہوتا چلا گیا۔

شروع شروع میں بڑے چوہدری صاحب کو بھی علی کا ہاسٹل منتقل ہونا اچھا نہیں لگا تھا لیکن رفتہ رفتہ جب انہیں علی کی کالج اور شہر میں بڑھتی ہوئی شہرت کی خبریں ملیں تو انہیں ایک گونہ اطمینان ہوا کہ علی کا ہاسٹل منتقل ہونے کا فیصلہ کچھ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ہاسٹل علی کی سوشل سرگرمیوں کا حصہ بنتا چلا گیا۔ کالج کے دوستوں کے علاوہ شہر کے معززین اور سرکردہ لوگ بھی گاہے بگاہے علی سے ملنے ہاسٹل آنے لگے۔ کچھ لوگ گپ شپ کے لیے آتے اور کچھ اپنے چھوٹے موٹے مسائل کے بارے میں علی سے مشورہ کرنے چلے آتے۔ علی کا چیزوں کو الگ سے دیکھنے کا انداز اور مسائل کا جزئیاتی تجزیہ کرنے کا طریقہ انہیں اچھا لگتا۔

علی سے ہاسٹل میں ملنے آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ کسی کا سیاست سے تعلق تھا تو کسی کا کاروبار سے۔ کوئی ملازم پیشہ تھا تو کوئی حالات کا شکار ملازمت کا خواستگار۔ کوئی شہر سے نکلنے والے اخبار کا صحافی تھا تو کوئی کالم نگار۔ کوئی شاعر تھا تو کوئی ادیب۔

علی جتنے زیادہ لوگوں سے ملتا اس کی شخصیت کا پھول کچھ اور کھل اٹھتا۔ اس کے خیالات میں مزید وسعت پیدا ہو جاتی۔ اور اس کی شخصیت کی جاذبیت کچھ اور بڑھ جاتی۔

ہمہ وقت علی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اظہر کی شخصیت میں بھی ایک نکھار پیدا ہونے لگا تھا۔ مسلسل قرب اور فکری ہم آہنگی نے اظہر کو تقریباً علی کا عکس بنا دیا تھا۔

اب اسے زندگی کی بڑی تصویر اور بڑے تناظر جیسے کلمات کی سمجھ آنے لگی تھی۔ علی کے ساتھ اظہر کی دوستی میں ایک نئی جہت آنے لگی تھی جس سے اظہر کے دل میں علی کے لیے احترام اور محبت کے نئے جذبے کروٹیں لینے لگے۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ اپنا سارا مستقبل علی کے ساتھ مل کر بڑے تناظر میں زندگی کی بڑی تصویر بنانے کے لیے صرف کرے گا۔

اظہر کی دوستی سے علی کے جذبوں کو بھی نئی تازگی ملی اور اس نے خود کو زندگی میں ایک بڑا کردار ادا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔

فصل 4

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ علی ایک نوارد طالب علم کی طرح گاؤں سے شہر آیا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نہ صرف کالج کمیونٹی میں اپنے لیے ایک جگہ بنالی تھی بلکہ وہ شہر کی اشرافیہ کا ایک اہم رکن بن چکا تھا۔

شہر کے بڑے بڑے کاروباری حضرات اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے۔ اکثر خواہش کرتے کہ وہ ان کے کاروبار کا حصہ بن جائے۔ کئی ایک نے اچھی اچھی پیشکشیں بھی کیں لیکن علی جس طرح اپنے سماجی عمل میں متحرک تھا اس سے کہیں زیادہ اپنے تعلیمی معاملات میں یکسو تھا۔ وہ اپنی خاندانی لڑی میں تیسرا فرد تھا جو کالج سے گریجوایشن کرنے جا رہا تھا۔

اس نے کئی بار بڑے چوہدری صاحب سے سنا تھا کہ جب ان کے والد چوہدری احمد علی نے کالج سے بی اے کیا تھا سارے علاقے میں ان کے علاوہ کوئی بی اے پاس شخص نہیں تھا۔

اسی وجہ سے چوہدری احمد علی ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ بہت اہتمام کے ساتھ بی اے لکھا کرتے تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ ان کی شناسائی بھی کالج ہی کے ایک جلسے میں ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ شناسائی جان پہچان میں اور پھر قریبی تعلق میں بدل گئی۔ یہاں تک کہ چوہدری احمد علی قائد اعظم کی راہنمائی میں مسلم لیگ کی روحِ رواں بن گئے۔ علی علمی اور سیاسی طور پر اس خاندانی روایت کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

علی کا بی اے میں آخری سال تھا۔ دوران تعلیم اس نے کالج یونین کے معاملات میں دلچسپی ضرور لی لیکن اس نے یونین کا عہدے دار بننے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کالج کی یونین پر بنیاد پرستوں کا قبضہ تھا اور اس کی سوچ ذرا مذہب سے ہٹ کر تھی۔

قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریک میں بنیاد پرستوں نے تعلیمی اداروں میں طالب علموں کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

بنیاد پرستوں کی کوشش تھی کہ زیادہ تر طالب علم ان کے نقطہ نظر سے قومی معاملات کو دیکھیں۔ لیکن وہ قائداعظم کی سوچ اور فلسفے سے زیادہ متاثر تھا۔ اس لیے وہ بنیاد پرستوں سے دور رہتا اور کوشش کرتا کہ ان کی سرگرمیوں سے جس قدر ہو سکے دور رہے۔

اس کے علاوہ کالج میں اس کے قریبی دوست اور ساتھی اظہر کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی والدہ کا قادیانی فرقے سے تعلق ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اس کے والد میجر ناصر خود قادیانی نہیں تھے لیکن اپنی بیوی کی وجہ سے قادیانیوں کے بہت قریب تھے اور اکثر ان کی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔

اظہر نے کبھی ان معاملات کی تصدیق کی نہ تردید۔ علی کے ساتھ اظہر کی دوستی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے اس کے ساتھ کبھی مذہبی حوالے سے گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ چیزوں کو معروضی انداز میں دیکھنے کا عادی تھا۔ اس کی یہی معروضیت اسے عام لوگوں سے ممتاز کرتی تھی۔

کالج میں یونین کے الیکشن کا دور شروع ہوا تو علی کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یونین کی صدارت کا الیکشن لڑے۔

علی نے پہلے پہل تو یونین کے بکھیڑوں سے دور رہنا چاہا لیکن پھر دوستوں کے اصرار پر وہ یونین کی صدارت کا الیکشن لڑنے پر تیار ہو گیا۔

جو دوست چاہتے تھے کہ وہ یونین کا الیکشن لڑے ان کے ساتھ مل کر اس نے کالج کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا تو اسے پچھلے کئی سالوں سے اسلام پسند، مودودی کے پیروکار، کالج کی یونین پر مسلط دکھائی دیئے۔

اس نے اپنے کالج کے برسوں میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ دیکھی تھی کہ ہر سال جب یونین کے الیکشن ہوتے مودودی کے اسلامی فورم کے مرکزی عہدے داران ہمیشہ ہاسٹل میں آکر مقیم ہو جاتے اور بنیاد پرست طالب علموں کی الیکشن میں مدد کرتے۔

وہ ہاسٹل میں بیٹھ کر الیکشن کے لیے لائحہ عمل تیار کرتے، جس کے تحت الیکشن لڑنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی، ہمدردوں سے پیسے اکٹھے کیئے جاتے، ہر طالب علم سے رابطہ کرکے اسے اسلام پسند امیدواروں کو ووٹ دینے کی تلقین کی جاتی، اگر کوئی ان کی بات ماننے سے انکار کرتا تو اسے باقاعدہ ڈرایا اور دھمکایا جاتا۔

علی نے جب الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو اس نے یہ سب باتیں اپنے دوستوں کے سامنے رکھیں۔ اس نے ان پر واضح کر دیا کہ کالج میں اس کا اثرورسوخ ہے اور یہ بات اسلام پسند بھی جانتے ہیں لیکن یہ اثرورسوخ الیکشن جیتنے کے لیے کافی نہیں ۔ اس نے انہیں بتایا کہ الیکشن جیتنے کے لیے باقاعدہ ایک لائحہ عمل طے کرنا ہو گا، ایک ٹیم کھڑی کرنی ہو گی، اور ہر طالب علم سے رابطہ کرنا ہو گا۔ روزانہ کی بنیادوں پر ہر روز مل کر جائزہ لینا ہو گا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور اگر کہیں کوئی کمی دکھائی دے تو اسے فوراً دُور کیا جائے۔

اپنے دوستوں کے سامنے یہ معروضات رکھنے کے بعد علی نے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ اظہر اس کے ساتھ جنرل سکریڑی کے طور پر الیکشن لڑے۔

اظہر کے نام پر علی کے دوستوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر تقریباً بیک زبان مشورہ دیا کہ اظہر کی علی کے ساتھ دوستی بجا لیکن اس کی امیدواروں کی ٹیم میں شمولیت اسلام پسند طالب علموں کو علی کے خلاف اتنا اسلحہ مہیا کرے گی کہ ان کے لیے الیکشن جیتنا مشکل ہو گا۔

علی نے گہری سوچ کے انداز میں اپنے دوستوں کی طرف دیکھا اور پھر ان کا مدعا سمجھتے ہوئے خندہ بہ لب ان سے کہا کہ اظہر کا نام اس کے امیدواروں کی ٹیم میں شامل کرنا بہت ضروری ہے۔ اظہر کی شمولیت سے یہ ایک ڈریم ٹیم بنے گی جو قائداعظم کے نظریات اور فکر و فلسفے کی آئینہ دار ہو گی۔ ڈریم ٹیم کے الفاظ سے علی کے دوستوں کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ اور وہ بغیر بحث و تمحیص اظہر کا نام امیدواروں کی فہرست میں بطور جنرل سیکریڑی شامل کرنے پر تیار ہو گئے۔

اس بنیادی فیصلے کے بعد وہیں پر علی نے ایک الیکشن کمیٹی بنائی۔ صفدر شاہ کو ڈریم ٹیم کا کوارڈی نیٹر مقرر کیا۔ سلیم موٹے کو پریس اور پبلسٹی سکریڑی کی ذمہ داریاں دیں۔ خالد شیخ کو لاجسٹک سپورٹ کی ذمہ داری دی۔ اپنے پاس طالب علموں سے رابطے اور روزانہ کے بنیادوں پر الیکشن کے حوالے سے ہونے والی پراگرس کی مانیٹرنگ کی ذمہ داری رکھی اور اظہر کو اپنا مددگار مقرر کیا۔

اگلے دن جب علی اور اظہر نے الیکشن آفس میں بطور صدر اور جنرل سکریڑی کی امیدواری کے کاغذات جمع کروائے تو ان کے امیدوار بننے کی خبر کالج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئ۔

اسلام پسند جن کی اب تک کالج یونین کے معاملات پر اجارہ داری چلی آ رہی تھی توقع نہیں کر رہے تھے کہ علی جیسے اثر و رسوخ والا طالب علم اچانک کالج یونین کا صدر بننے کا امیدوار بن جائے گا اور ان کے لیے ایک ایسا چیلنج کھڑا کر دے گا جس سے ان کی کالج میں اجارہ داری قائم رکھنے کی سالہا سال سے کی گئ محنت پر پانی پھرنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

اسلام پسند طالب علموں نے فوراً جماعت اسلامی کے ہیڈ آفس سے رابطہ کر کے مدد کی درخواست کی۔ ان کی درخواست کے جواب میں جماعت نے فوراً ایک سہ رکنی ٹیم اس ہدایت کے ساتھ روانہ کی کہ ان کے امیدواروں کو یہ الیکشن کسی صورت نہیں ہارنے چاہیں ورنہ پورے ملک میں مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کے حامی طالب علموں کے خلاف ایک فضا بننا شروع ہو جائے گی اور ان کے لیے دانش گاہوں میں اپنا رسوخ قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

ادھر جماعت اسلامی کی تین رکنی ٹیم کالج کے الیکشن میں مثبت نتائج حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوئی ادھر علی نے اپنی الیکشن کمیٹی سے صلاح و مشورے کے بعد اس کمیٹی کو الیکشن سے دور رکھنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

اسلام پسندوں نے علی کے مقابلے میں راجہ اشرف کو صدارت کے لیے اپنا امیدوار نامزد کیا۔ راجہ اشرف کا باپ راجہ شریف شہر کا سب سے بڑا ٹرانسپورٹر تھا۔ ملک کے تمام بڑے شہروں میں لوگ اس کی بسوں "راجہ ٹرانسپورٹس" کے ذریعے سفر کرتے تھے۔

پورے ملک میں شاید ہی کوئی شخص ہو گا جس نے راجہ ٹرانسپورٹس کا نام نہ سنا ہو یا کبھی ان کی بس پر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر نہ کیا ہو۔

راجہ اشرف کی بطور امیدوار نامزدگی کے بعد بنیاد پرستوں کے خدشات قدرے کم ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ راجہ اشرف کے لیے علی کو الیکشن میں شکست دینا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ لیکن وہ الیکشن کے لیے مہم چلانے کی اہمیت سے بھی بخوبی باخبر تھے۔

ملکی سطح پر اسلام پسند قائداعظم کے تصورات اور نظریات کے برعکس ہر طرح کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان کو زندگی کے ان ابتدائی سالوں میں ایک مذہبی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ پہلے ہی قرارداد مقاصد کا پھندا پاکستان کی گردن میں ڈال چکے تھے اور اب کوشش کر رہے تھے کہ ہر سطح پر اس پھندے کو اس طرح ہر کسی کی گردن میں کس دیا جائے کہ ریاست اور ریاست کے تمام ادارے ان کے تابع مہمل بن کر رہ جائیں۔

علی کو اپنے دیہاتی پسِ منظر کے باوجود اس صورت حال کا خوب اندازہ تھا۔ اس کے نزدیک تعلیمی ادارے وہ گہوارے تھے جنہیں بنیاد پرست قائداعظم کے تصورات کے برعکس پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کے لیے بطور اڈے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

کچھ ہی عرصہ پہلے علی پاکستان میں ان مذہبی قوتوں کی طرف سے قادیانیوں کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے پس پردہ ان قوتوں کے اصل عزائم کی کئی جھلکیاں دیکھ چکا تھا۔ اس تناظر میں اس نے تہیہ کیا کہ وہ کسی صورت اسلام پسندوں کو کالج کے الیکشن نہیں جیتنے دے گا۔ اسی لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کالج کے الیکشن کے اکھاڑے میں خود اترا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ کینسر کی چھوٹی سی گلٹی کس طرح انسان کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے کر آخر کار اسے موت کی وادیوں میں دھکیل دیتی ہے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ قائد اعظم کا پاکستان بنیاد پرستوں کی رزم گاہ بن جائے اور کروڑوں انسان جنہوں نے پاکستان کی شکل میں ایک پر امن گھر کی تمنا کی تھی ایک ایسے جہنم میں بدل جائے جہاں ہر وقت ایک دَاروغہ ان کی نگرانی کر رہا ہو اور کسی نئے ابھرتے سورج کی کرنوں کی روشنی میں انہیں خود نگری کی اجازت نہ ہو۔

فصل 5

جیسے جیسے الیکشن کا دن قریب آرہا تھا راجہ اشرف نے بنیاد پرستوں کی مدد سے سارے شہر اور کالج کے درو دیوار کو پوسٹروں سے بھر دیا۔

رنگ برنگے چھوٹے بڑے پوسٹر راجہ اشرف کی تصویروں کے ساتھ جن پر نصر من اللہ و فتح قریب کی آیت درج تھی کالج آنے جانے والے تمام راستوں پر آویزاں تھے۔

علی کے ساتھی راجہ اشرف کے پوسٹروں کی فروانی دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ لیکن علی حسب معمول پُرعزم، پُراعتماد، ایک وقت میں ایک طالب علم کی اسٹراٹیجی پر عمل کرتے ہوئے کالج کے ہر طالب علم سے رابطہ کر رہا تھا۔

وہ جس طالب علم سے ملتا اس سے چند سوال کرتا اور پھر یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا کہ ہو سکے تو وہ ان سوالوں پر غور کرے اور جب ووٹ دینے کا وقت آئے تو ان سوالوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جس کو اس کا دل چاہے ووٹ دے۔ وہ کہتا انہیں سوچنا چاہیئے کہ پاکستان کس نے بنایا تھا؟ قائداعظم نے یا بنیاد پرستوں نے؟ ہم پاکستان کو کیسا پاکستان بنانا چاہتے ہیں؟ قائداعظم کا پاکستان یا بنیاد پرستوں کا؟ آیا ہم پاکستان کو ایک جدید ترقی یافتہ ملک بنانا چاہتے ہیں یا اسے ایک دقیانوسی قدیم ملک کے طور پر زندگی کی دوڑ میں رینگتے دیکھنا چاہتے ہیں؟

ان سوالوں کے ساتھ وہ ہر ملنے والے طالب علم کو یہ ہدایت بھی کرتا کہ اگر اسے یا اس کے دوستوں کے ذہنوں میں اس کے اٹھائے سوالوں کے بارے کوئی ابہام ہو تو وہ ان کے کلاس روم میں آکر ان کے ہر سوال کی وضاحت کرنے میں خوشی محسوس کرے گا۔

بنیاد پرست اپنے پوسٹروں کے جواب میں علی کے پوسٹروں کی عدم موجودگی پر حیران تھے کہ آخر علی اپنی انتخابی مہم کیوں نہیں چلا رہا۔ گزرتے وقت کے ساتھ انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ راجہ اشرف کے

بطور صدر امیدوار بننے کے بعد علی کو اپنی کامیابی کے امکانات مسدود ہوتے دکھائی دے رہے ہیں اس لیے اس نے پوسٹروں پر پیسے ضائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

دوسری طرف علی کی خاموش کمپین کی اسٹراٹیجی رنگ لا رہی تھی اور زیادہ سے زیادہ طالب علموں کے گروپ اسے شب وروز مل کر اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کا عہد کر رہے تھے۔

شہر میں لوگوں کو کالج کے الیکشن کی خبریں ملیں تو تمام معززین شہر نے یکے بعد دیگرے علی کو مل کر مدد کی پیشکش کی لیکن علی نے یہ کہہ کر ہر پیشکش شکریئے کے ساتھ مسترد کر دی کہ یہ الیکشن خالصتاً کالج کا اندرونی معاملہ ہے اور شہر والوں کو اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیئے۔ الیکشن سے چند دن قبل میئر خواجہ احسن بھی علی سے ملنے چلے آئے۔

انہوں نے علی کے الیکشن لڑنے کے فیصلے کی تعریف کی۔ انہوں نے کہا گزشتہ کئی سالوں سے بنیاد پرستوں نے کالج کو اپنی سرگرمیوں کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے اور اب یہاں علمی سرگرمیاں کم اور مذہبی سرگرمیاں زیادہ وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

علی نے میئر شہر کو تسلی دی کہ صدر منتخب ہو کر وہ کالج کو غیر متعلقہ مذہبی سرگرمیوں سے پاک کر دے گا اور اسے خالصتاً ایک تعلیمی درسگاہ بنانے میں کالج اسٹاف کی مدد کرے گا۔

"لیکن علی یہ کیسے ہو گا۔ میں نے کالج آتے ہوئے ہر جگہ شریف زادے کے پوسٹر دیکھے ہیں مجھے تمہارا کوئی پوسٹر دکھائی نہیں دیا۔" انہوں نے ازراہِ تمسخر راجہ اشرف کے والد کے نام راجہ شریف کی نسبت سے اسے شریف زادہ کہہ کر اس کا ذکر کیا۔

راجہ اشرف کے لیے شریف زادے کے الفاظ سن کر علی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میئرِ شہر کا شکریہ ادا کیا اور ان کو اپنی الیکشن اسٹراٹیجی بتائی۔ ساتھ ہی طالب علموں سے اپنی انفرادی اور ان کے گروپوں کے ساتھ اجتماعی ملاقاتوں کے بارے میں بریفنگ دی۔ تفصیل سن کر

میئر نے علی کی سیاسی بصیرت کی تعریف کی اور امید ظاہر کی کہ یہ ایک کامیاب اسٹر اٹیجی ثابت ہو گی اور علی یقیناً الیکشن جیت کر کالج یونین کا صدر بن جائے گا۔

دوسری طرف شہر کے سب بنیاد پرست راجہ اشرف کی مدد کے لیے اُمڈے چلے آرہے تھے۔ کالج کے ہر کونے میں کوئی ایک بنیاد پرست چند طالب علموں کے گروپ کے ساتھ کھڑا انہیں راجہ اشرف کو کامیاب بنانے کی تلقین کرتا دکھائی دیتا۔

راجہ شریف نے اپنے بیٹے کو کالج یونین کا صدر بنوانے کے لیے اپنی تجوری کے منہ کھول دیئے۔ اس نے اپنے کارندوں کو ہدایت کی کہ شہر کی تمام مسجدوں میں آنے والے نمازیوں کو آگاہ کریں کہ کالج کے الیکشن میں منکرین اسلام کالج یونین پر قبضہ کرنے جارہے ہیں۔

ان کی چالوں میں سب سے خطرناک چال علی کے دوست اظہر کے بارے میں قادیانی ہونے کا الزام تھا۔ یہی وہ چیز تھی جس کے خدشے کا اظہار علی کے دوستوں نے اس وقت علی کے ساتھ کیا تھا جب اس نے اظہر کو جنرل سکریٹری کا امیدوار بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

علی کے لیے اسلام پسندوں کا یہ حملہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ مذہب پسند قوتیں اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں کہاں تک جاسکتی ہیں۔

اسے چند سال قبل پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریک کے اندوہناک واقعات ابھی یاد تھے۔ مذہب کے نام پر کھیلی جانے والی وہ خون کی ہولی یاد تھی جس نے پاکستان کے دامن پر نفرت کی ایسی تحریریں لکھ دی تھیں جس میں سب کچھ جل کر بھسم ہو سکتا تھا۔ گھر، کھیت، کارخانے، گاؤں، شہر، افراد اور خاندان جل سکتے تھے۔ یہاں تک کہ سارا پاکستان راکھ کا ڈھیر بن سکتا تھا۔

علی جانتا تھا کہ مذھب آگ اور خون کا ایک ایسا کھیل ہے جسے کھیلنے والے چاہیں بھی تو تباہی و بربادی سے نہیں بچ سکتے۔ انہیں ہر حال میں آگ اور خون کے ایک ایسے دریا سے گزرنا پڑتا ہے جس کا کسی کے پاس نہ پہلے کوئی علاج تھا اور نہ اب۔

راجہ شریف کے کارندوں نے جب اظہر کے قادیانی ہونے کے حوالے سے علی پر حملے شروع کیے تو اس کے دوست پریشان ہو گئے۔ لیکن علی کے اعتماد میں کوئی تزلزل نہ آیا۔ اس نے سب دوستوں کو ہدایت کی کہ وہ اس مسئلے پر کسی سے کوئی گفتگو نہ کریں۔ اگر کوئی اظہر کے قادیانی ہونے کے بارے میں سوال اُٹھائے تو اسے اس کا ذاتی مسئلہ کہہ کر بات ختم کر دی جائے۔

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ الیکشن سے ایک رات پہلے کالج کے بڑے کمپاونڈ میں جلسے کا اہتمام کریں، شہر کے مشہور اور سب سے بڑے موسیقی کے بینڈ کو بلائیں اور اس مسئلے کو اس جلسے کے لیے چھوڑ دیں۔

علی کی ہدایات کے مطابق اس کے ساتھیوں نے الیکشن کی رات کالج کے پائیں باغ میں جلسے کا اعلان کر دیا۔

جلسے کے لیے انہوں نے علی کی ہدایت کے مطابق شہر کے سب سے بڑے اور مشہور بینڈ کو موسیقی کے لیے طلب کیا۔

راجہ اشرف اور اس کے ساتھی، علی کے جلسے کے اعلان سے کچھ پریشان ہوئے لیکن ان کے پاس موسیقی کے ساتھ اس جلسے کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسلام پسند موسیقی سے ویسے ہی بھاگتے ہیں جیسے لاحول سے شیطان۔

ویسے وہ علی کے جلسے کے خلاف ایسی کوئی حرکت کر بھی نہیں سکتے تھے جس سے جلسے میں انتشار پیدا ہوتا-وہ پراپیگنڈے کی آخری حدود تو چُھو سکتے تھے لیکن علی کے جلسے کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کے نتائج کا انہیں خوب اندازہ تھا۔

اس لیے انہوں نے اگلے چند دن تک اپنی تمام توانائیاں اس بات پر لگا دیں کہ علی کے جلسے میں کم سے کم لوگ شامل ہوں اور اس طرح اس کا جلسہ ناکام ہو جائے۔

لیکن الیکشن کی رات جب علی کے ساتھیوں نے کالج کے پائیں باغ میں جلسے کے لیے اسٹیج سجائی اور بینڈ نے بلند آہنگ رجزیہ دُھنیں بجانا شروع کیں تو کالج کے سارے طالب علم جوق در جوق ٹولیوں کی صورت جلسہ گاہ پہنچنا شروع ہو گئے۔

جب باغ طالب علموں سے بھر گیا تو علی نے اسٹیج پر جا کر موسیقاروں کو چند لمحوں کے لیے موسیقی روکنے کی گزارش کی اور پھر جلسے میں اکٹھے ہونے والے طالب علموں سے یوں مخاطب ہوا:

"دوستو اور ساتھیو، کل ہم کالج میں ایک نئی تاریخ رقم کرنے جا رہے ہیں۔ اور یہ تاریخ آپ لوگوں کے ہاتھوں لکھی جائے گی۔ بظاہر کل کے الیکشن اس کالج کے طالب علموں کی یونین کی صدارت کا فیصلہ کریں گے لیکن یہ الیکشن دراصل پاکستان کے مستقبل کی سَمت تعین کریں گے۔ کل جب آپ ووٹ دیں گے تو آپ اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ کل جن لوگوں نے پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنی ہے ان کی اس ملک کے بارے میں ترجیحات کیا ہیں۔

کل جب آپ راجہ اشرف یا علی حسین میں سے کسی ایک کے لیے ووٹ دیں گے تو آپ محض دو افراد کے لیے ووٹ نہیں دیں گے بلکہ دو نقطہ ہائے نظر میں سے ایک کا چناؤ کریں گے۔ کل آپ یہ فیصلہ کریں گے کہ کیا آپ اپنی اجتماعی زندگیاں اس طرح گزارنا چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگیوں پر مکمل طور پر مذھب کی چھاپ ہو اور مذہب کے باہر آپ نہ کچھ سوچ سکیں نہ کچھ کر سکیں یا آپ مذہب کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا چاہتے ہیں جہاں پاکستان کے عام آدمیوں پر ترقی اور خوشحالی کے دروازے کھلیں اور وہ دنیا کی باقی باوقار اقوام کے افراد کی طرح عزت اور آبرو سے اپنی زندگیاں گزاریں۔

پاکستان فی الحال ایک نوزائیدہ مملکت ہے۔ قانون ساز اسمبلی نے سخت محنت کے بعد امورِ سلطنت چلانے کے لیے ایک آئین بنا دیا ہے۔ اگلے سال تک اس آئین کے تحت ملک بھر میں اسمبلیوں کے الیکشن ہوں گے تو ریاست کے معاملات آئین کے مطابق چلنا شروع ہو جائیں گے۔

یہ آئین بنانے کے لیے ہمارے سیاست دانوں نے بڑی تگ و دو کی ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے سب نمائندگان نے بہت مشکل سے اتفاق رائے سے یہ آئین بنایا ہے۔ سب پاکستانیوں کا فرض ہے کہ اس آئین کے تحت اپنے سماجی، سیاسی اور ریاستی امُور چلائیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب رہے تو ہماری کامیابیوں کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ لیکن اگر اس آئین کے باوجود ہم تفرقانہ نظریات آگے بڑھاتے رہے تو پھر خزاں کے پتوں کی طرح بکھر جائیں گے۔

میں امید کرتا ہوں کہ کل جب آپ ووٹ ڈالنے جائیں گے تو میری یہ معروضات اپنے ذہن میں رکھیں گے۔"

یہ کہہ کر علی نے موسیقی کے بینڈ کو ہاتھ سے اشارہ کیا تو انہوں نے ڈم ڈم ڈماڈم -ڈم ڈم ڈماڈم۔ دھن بجانا شروع کی سارا جلسہ صدر یونین علی حسین زندہ باد کے نعروں سے گُونج اُٹھا۔

فصل 6

اگلے دن صبح علی ابھی سو کر نہیں اٹھا تھا کہ دروازے پر دستک سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو باہر میئر کا آفس کلرک نور حسین کھڑا تھا۔

علی نے اتنی صبح آنے کی وجہ پوچھی تو نور حسین نے کہا کہ اسے میئر صاحب نے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ انہوں نے ایس پی صاحب کو رات ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ آج پولیس کی کافی نفری کالج کے باہر تعین کریں۔

علی نے کہا مجھے تو میئر صاحب نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ کالج کے باہر پولیس کی نفری کی کیا ضرورت تھی۔؟

نور حسین نے کہارات میئر کے گھر پر ڈنر تھا۔ سب عمائدین شہر تشریف فرما تھے۔ آپ کے کالج کے کے پرنسپل بھی وہاں موجود تھے۔ کالج کا الیکشن عمائدینِ شہر کا خاص موضوعِ گفتگو تھا۔ سب لوگ الیکشن میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ رات کے جلسے کی کامیابی کی خبر سب کو ہو چکی تھی۔ سب کا اندازہ تھا کہ رات کے جلسے نے آپ کی کامیابی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ آپ کی ممکنہ کامیابی پر سارے خوش تھے۔ لیکن سب اس خیال سے متفق تھے کہ بنیاد پرست اس شکست کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کریں گے۔ اتنے سالوں بعد اتنے بڑے اور اہم کالج کی یونین کا کنٹرول ہاتھ سے جاتے دیکھ کر ہو سکتا ہے وہ بلوے پر اُتر آئیں۔

آپ کی ممکنہ کامیابی پر سب کی خوشی کی وجہ بھی دراصل بنیاد پرستوں کا ہمہ وقت بلوے اور دنگے پر آمادگی کا رویہ ہے۔ سب عمائدینِ شہر کا خیال تھا کہ منافقت بنیاد پرستوں کا ٹریڈ مارک اور مذہب کی بالا دستی کے لیے دنگا، فساد، قتل و غارت اور کچھ بھی کر گزرنا ان کا مشغلہ ہے۔ یہ کلام الٰہی کی تجارت کرتے ہیں اور نبی کی حرمت اور اہل بیت کی عزت کی گلی کوچوں میں کھلے بندوں بے توقیری کرتے ہیں۔

یہ خود قران کے صفحات جلا کر اس کا الزام کبھی قادیانیوں اور کبھی کمیونسٹوں کے سر لگاتے ہیں اور پھر ملک میں ہنگامہ آرائی کرتے ہیں۔ لوگوں کی املاک کو آگ لگاتے اور معاشرے کا امن و امان تباہ کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے میئر صاحب نے رات ہی ایس پی صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ پولیس کی کافی نفری کالج کے گرد متعین کر دیں۔ اس بارے میں انہوں نے کالج کے پرنسپل کو بھی وہیں مطلع کر دیا تھا۔ پولیس کالج کے اندر داخل نہیں ہوگی تاہم کسی بھی ایمر جنسی سے نپٹنے کے لیے کالج کے ارد گرد موجود رہے گی۔

میئر صاحب آپ سے ملنے خود آنا چاہتے تھے لیکن وہ الیکشن کی صبح اتنی جلدی آکر کسی کو کوئی غلط تاثر نہیں دینا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے رات ہی مجھے کہہ دیا تھا کہ میں دفتر جانے سے پہلے آپ کو اطلاع کرتا جاؤں۔

علی نے نور حسین سے کہا کہ وہ میئر صاحب کا اس مہربانی کے لیے شکریہ ادا کر دے۔ اور ساتھ ہی اس نے کہا میئر صاحب سے کہہ دینا کہ پولیس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اگر وہ اسلام پسندوں کے ہاتھوں نقصِ امن کا کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو بھلے پولیس بھجوا دیں۔

نور حسین سے فارغ ہو کر علی نے غسل کیا، کپڑے تبدیل کیے اور ناشتے کے لیے کیفے ٹیریا پہنچ گیا۔ وہاں اس کے بیشتر دوست پہلے سے موجود تھے۔ سب نے گلے مل کر علی کو رات کے جلسے کی کامیابی کی مبارک باد دی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب کالج کی طرف چل دیے۔ کالج کے قریب پہنچے تو انہیں کچھ مشکوک لوگ کالج کے باہر ایک کیفے میں بیٹھے چائے پیتے دکھائی دیئے۔

جب علی اور اس کے دوست کیفے کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے مشکوک انداز میں علی اور اس کے دوستوں کا جائزہ لیا۔ لیکن اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ شاید کیفے کے آس پاس اور بہت سے طالب علموں کی موجودگی نے انہیں کسی غلط کام سے روک دیا تھا۔ ابھی علی اور اس کے دوست کیفے سے زیادہ دور نہیں

پہنچے تھے کہ ایس پی صاحب بھی پولیس کی نفری لے کر وہاں پہنچ گئے۔ پولیس کی نظر کیفے میں بیٹھے مشکوک لوگوں کی طرف نہ جا سکی جس کا فائدہ اٹھا کر وہ کیفے کے ساتھ والی گلی کے راستے رفو چکر ہو گئے۔

علی دل ہی دل میں میئر صاحب کی معاملہ فہمی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

دراصل اسلام پسندوں کو علی کے رات والے جلسے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے لیے الیکشن جیتنا ممکن نہیں ہو گا۔ انہوں نے پوری کوشش کی تھی کہ طالب علموں کو علی کے جلسے میں جانے سے روکیں لیکن علی کی شخصیت کا سحر، الیکشن کے لیے پوسٹرز کی بجائے بذات خود طالب علموں سے مل کر انہیں اپنا نقطہ نظر سمجھانا اور ان کے ساتھ گروپ کی صورت میں ملاقاتوں نے اور پھر شہر کے مشہور اور سب سے بڑے موسیقی کے بینڈ کی موجودگی نے بنیاد پرستوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

نوجوانوں میں بے پناہ توانائی ہوتی ہے۔ وہ زندگی میں ہلچل اور ہاؤ ہُو کے خواہاں ہوتے ہیں۔ خوبصورت موسیقی ان کی طبیعتوں پر ایسے ہی اثر انداز ہوتی ہے جیسے پھولوں پر صبح کی شبنم یا سر شام شرابیوں کے لیے شراب کے جام۔

نہ وہ بنیاد پرستوں کے روکنے سے علی کے جلسے میں جانے سے رُکے اور نہ ہی اُن کا پراپیگنڈہ اُنہیں علی اور اُس کی ڈریم ٹیم کو ووٹ دینے سے روک سکا۔ انجامِ کار سارے دن کی ووٹنگ کے بعد جب الیکشن کمیٹی نے بیلٹ باکس کھولے تو علی اور اس کی ڈریم ٹیم کے بیلٹ باکسز ووٹوں سے ٹُھسے ہوئے تھے جب کہ اسلام پسندوں کو صرف چند ووٹ ملے تھے۔

علی کے بیلٹ باکس سے نکلنے والے ووٹ دراصل ووٹ نہیں وہ خواب تھے جو پاکستان کے ابتدائی سالوں میں پاکستان کے نوجوان دیکھ رہے تھے۔

ملک میں حکومتوں کے ٹُوٹنے اور بننے، جن کے بارے میں پنڈت نہرو نے ایک بار مذاقاً کہا تھا کہ میں نے اتنی دھوتیاں نہیں بدلیں جتنی پاکستان میں حکومتیں بدل چکی ہیں، اور طول و عرض میں پھیلتی طوائف

الملوکی سے پاکستان کے نوجوان کچھ بد دل ضرور تھے لیکن ان کے خواب زندہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جیسے ہی ملک میں بنیادی معاملات طے ہو جائیں گے پاکستان کی تعمیر و ترقی کا عمل شروع ہو جائے گا۔

زراعت میں ترقی ہو گی۔ بڑے بڑے صنعتی سنٹر بنیں گے۔ جدید اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بنیں گی۔ پرانے شہروں کو رفتہ رفتہ نئے شہروں سے بدل دیا جائے گا۔ جو جدید سہولیات سے مزّین ہوں گے۔ جہاں ہر شخص کو زندگی کی بنیادی سہولتیں میسر ہوں گی۔ بچوں کو اچھی تعلیم ملے گی۔ سفر کے لیے جدید اور منظم ٹرانسپورٹیشن کا نظام ہو گا۔ ہر شخص کے سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق محفوظ ہوں گے۔ ریاست کی نظروں میں تمام پاکستانی برابر ہوں گے۔ مذہبی، نسلی یا لسانی بنیادوں پر انسانوں میں تمیز نہیں کی جائے گی۔ کسی انسان کی زندگی میں کوئی خلا نہیں ہو گا۔ اور تمام پاکستانی ایک قوم کی حیثیت سے مسلسل روشن مستقبل کی طرف ہمیشہ گامزن رہیں گے۔

یہ سارے خواب ان کے پُرعزم اور پُراعتماد روی ہئے سے عیاں تھے۔ اسی لیے جب الیکشن کمیٹی نے علی کی ڈریم ٹیم کے ووٹوں سے ٹھسے بیلٹ باکسز کو ٹیبل پر اُلٹا تو سارا کالج علی زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔

فصل 7

الیکشن سے اٹھنے والا گرد و غبار کچھ کم ہوا تو علی نے اصل ایشوز کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ اسے پاکستان کی معاشرتی زندگی میں پھیلتی مذہبی انتہاپسندی کی آکاش بیل کی فکر ہر وقت کھائے جاتی تھی۔

اس کی تشویش خاص طور پر اس آکاش بیل کے وہ تانے بانے تھے جن کی جڑیں تو لندن اور واشنگٹن کی یخ بستہ فضاؤں میں رکھے گملوں میں تھیں لیکن ایک کے بعد دوسرا اسلامی ملک اس آکاش بیل کی زد میں آتا جا رہا تھا۔

بڑے بڑے سوچنے سمجھنے والے لوگ جانے ان جانے میں اس آکاش بیل کو تراوت فراہم کرنے میں اپنی توانائیاں خرچ کر رہے تھے۔ اسے دوسرے اسلامی ممالک کی تو فکر نہیں تھی۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ لیکن پاکستان میں اس آکاش بیل کا پھیلاؤ اسے کھائے جاتا تھا۔

وہ مذہب کی انسانی زندگی میں اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرتا تھا لیکن مذہبی اجتماعیت اور خاص طور پر ایسی اجتماعیت جس میں سارا سماج اپنی ساری توانائیاں اور سارا وقت مذہب اور مذہبی اقدار کی آبیاری اور نگہداشت پر لگا دے اس کے نزدیک کچھ ایسی شادی کے معاملے کی طرح تھا جس میں زندگی کے باقی سب لوازمات تو پیچھے چلے جائیں لیکن جنس اس پر اس طرح مسلط ہو کہ شادی شدہ جوڑے کے چوبیس گھنٹے جنسیت کی نذر ہو جائیں۔

وہ اسلام کو ایک خوبصورت مذہب سمجھتا تھا لیکن سیاسی مُلا اسے ان دیووں کی شکل میں نظر آتے تھے جو مسلسل اسلام کی خوبصورتی کو مسخ کر رہے تھے اور اپنی ذاتی مقصد بر آری کے لیے مسلسل اسلام کے حسن کو داغدار کر رہے تھے۔

اسے اپنے گھر میں اپنے دادا احمد علی کی دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ ہونے والی وہ گفتگو کچھ کچھ یاد تھی جس میں پاکستان کے پہلے پرائم منسٹر لیاقت علی خان کی طرف سے قانون ساز اسمبلی میں پیش کی گئی قرارداد کے بارے میں اظہار خیال کیا جارہا تھا۔

قائداعظم کی وفات کے بعد علی کے دادا چوہدری احمد علی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گھر پر ان کی خبرگیری کے لیے آنے والے مسلم لیگی لیڈروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

اگرچہ دادا جان کی جسمانی توانائیاں ان کا ساتھ نہیں دیتی تھیں لیکن تیمارداری کے لیے آنے والوں سے گفتگو میں ان کا جوش دیدنی ہوتا تھا۔

لیاقت علی خان پر پہلے بھی انہیں اعتماد نہیں تھا۔ لیکن قراردادِ مقاصد میں مذہب کے حوالے سے شامل کی گئی شقوں پر اُنہیں سخت اعتراض تھا۔

وہ اکثر کہتے تھے کہ قرارداد مقاصد میں لیاقت علی خان نے مذہبی معاملات شامل کر کے پاکستان کی بنیادوں میں ایسی بارودی سرنگیں لگا دی ہیں جو مستقبل میں گاہے بگاہے پھٹتی رہیں گی اور ان کے پھٹنے سے پاکستان لہولہان ہوتا رہے گا۔

وہ ہر آنے والے سے یہی شکایت کرتے رہے کہ انہوں نے لیاقت علی خان کو قرارداد مقاصد میں قران اور سنت والی شِق شامل کرنے سے کیوں نہ روکا؟

اُنہیں اقلیتوں والی شِق پر بھی کافی اعتراض تھا۔ وہ پاکستانیوں میں رنگ، نسل، مذہب یا فرقوں کی بنیاد پر تقسیم کو بھی پاکستان کی بنیادوں میں لگی بارودی سرنگ سے تعبیر کرتے تھے۔

وہ قراردادِ مقاصد میں ان شِقوں کی شمولیت کو قائداعظم محمد علی جناح کی پاکستان قانون ساز اسمبلی میں کی گئی پہلی تقریر میں پیش کیے گئے راہنما اصولوں کی واضح خلاف ورزی سمجھتے تھے۔

تب علی کو ان باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ لیکن یہ باتیں اس کے ذہن میں روشنی کے قمقمے بن کر ہر وقت جلتی رہتی تھیں اور وہ اکثر قومی زندگی کے معاملات کی تفہیم کے لیے انہی باتوں کی روشنی میں غور و فکر کرتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب چند سال پہلے ملک میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلی تھی تو وہ اس پر خاصا اداس اور پریشان تھا۔ اس نے حتی الوسع کوشش کی تھی کہ اس تحریک کی خبریں اُس کے گاؤں میں نہ پہنچیں۔ گاؤں میں چند قادیانی خاندان تھے۔ ان کی اپنی کوئی مسجد نہیں تھی۔ لیکن وہ اکٹھے ہو کر کسی ایک گھر میں نماز ادا کرتے۔ علی اُن دنوں نوعمر تھا۔ ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ اُسے جب شہروں میں چلنے والی قادیانیوں کے خلاف تحریک کا پتہ چلا تو اُس نے قادیانیوں کے گھر جا کر ان کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کیا اور جامع مسجد کے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے درخواست کی کہ وہ اِس معاملے کو اپنی تقریروں کا موضوع نہ بنائیں اور اگر وہ اس مسئلے پر گفتگو کرنا بھی چاہیں تو اسے فرقہ وارانہ مسئلہ بنانے سے گریز کریں۔

مولوی صاحب کی سال بھر کی گندم اور چاول چونکہ چوہدری حسین کے کھیتوں سے آتے تھے۔ اس لیے اُنہوں نے علی کی بات نہ صرف پوری توجہ سے سنی بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔ علی کے اس چھوٹے سے قدم سے، جب پورا پنجاب قادیانیوں کے خلاف تحریک کی لپیٹ میں تھا، علی کے گاؤں میں کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا جس سے گاؤں کا سکون برباد ہوتا اور ہمیشہ کے لیے تلخ یادیں گاؤں والوں کے ذہنوں پر چھوڑ جاتا۔

کالج کی یونین کے صدر کا الیکشن جیتنے تک علی کے شعور میں اتنی پُختگی آچکی تھی کہ اُسے مذہب کی سیاست میں آمیزش کے معاشرے میں جنم لینے والے مضمرات کا بخوبی اندازہ ہونے لگا تھا۔ خاص طور پر مڈل ایسٹ میں جس طرح برطانیہ اور امریکہ کی خفیہ ایجنسیاں مذہبی جماعتوں کے سیاسی پروگرام سے اپنے مقاصد آگے بڑھا رہی تھیں اِس میں اُسے اُن پہلے سے بدحال ملکوں کا مستقبل خاصا تاریک نظر آتا تھا۔

اِس حوالے سے مڈل ایسٹ کی طرف سے پاکستان کی مذہبی جماعتوں میں آنے والا دن بدن بڑھتا ہوا اثر و رسوخ اُسے بہت پریشان کرتا تھا۔

اس تناظر میں جب وہ پاکستان کی سیاسی سکرین پر متحرک کرداروں کو دیکھتا تو اسے قائداعظم محمد علی جناح کے بعد حسین شہید سہروردی کی شکل میں روشنی کی ایک کرن نظر آتی۔

حسین شہید سہروردی نے پاکستان کا آئین بنانے میں جو کردار ادا کیا تھا اسے وہ خاص طور پر تحسین کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ پھر حسین شہید سہروردی کے چین جا کر دونوں ملکوں کے درمیان باہمی تعلقات کی بنیاد رکھنے کے معاہدات میں بھی اسے ایک اچھائی کا پہلو نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ حسین شہید سہروردی کے ہاتھوں پاکستان کے پہلے ایٹمی ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا قیام جو پاکستان میں انرجی کی ضروریات پوری کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا علی کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث تھا۔

ان کاموں کی وجہ سے علی کے دل میں حسین شہید سہروردی کے لیے ایک عقیدت اوراحترام کا جذبہ پایا جاتا تھا۔

اگرچہ حسین شہید سہروردی کی حکومت ایک سال کے مختصر عرصے میں ختم ہو چکی تھی لیکن علی کا خیال تھا کہ نئے آئین کے تحت جب ملک میں الیکشن ہوں گے تو اس بات کا امکان تھا کہ حسین شہید سہروردی دوبارہ برسر اقتدار آ کر پاکستان میں تعمیر و ترقی کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

حسین شہید سہروردی کی شخصیت میں علی کو ایسا ہیرو نظر آتا تھا جو نہ صرف مشرقی اور مغربی پاکستان کی وحدت قائم رکھ سکتا تھا بلکہ ملک کے دونوں حصوں میں اپنے ترقی پسندانہ خیالات سے ایسے سماج کی بنیاد رکھ سکتا تھا جس سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے لیے تعمیر و ترقی کے نئے راستے کھل سکتے تھے اور نوزائیدہ مملکت ایک حقیقی، متمول اور مستحکم ریاست میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

اس خیال کے تحت علی نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ کالج میں ایک جلسے کا اہتمام کریں گے جس میں حسین شہید سہروردی کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا جائے گا۔

اس جلسے میں وہ سب مل کر حسین شہید سہر وردی کو پاکستان کے لیے اُن کی خدمات کے لیے خراجِ تحسین پیش کریں گے۔

فصل 8

علی کے کہنے پر اس کے دوستوں نے کالج یونین کی طرف سے پہلی بار ایک ایسی شخصیت کو جلسے میں مہمانِ خصوصی کے طور پر منتخب کیا تھا جس سے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ محبت بھی کرتی تھی اور نفرت بھی۔

حسین شہید سے ان کی نفرت کی وجہ ان کا بعض بنیادی جمہوری اصولوں پر غیر لچک دار رویہ تھا۔ حسین شہید سہر وردی جانتے تھے کہ پاکستان کی نوزائیدہ اسٹیبلشمنٹ پر پنجابیوں اور مہاجروں نے مل کر قبضہ کر لیا ہے اور دونوں مزاجاً جمہوری اصولوں کو خاطر میں لانے کے قائل نہیں۔ پنجاب کی جاگیر دارانہ اور مہاجرین کی دربارانہ ثقافت کے باہمی ملاپ سے جو اسٹیبلشمنٹ معرضِ وجود میں آئی تھی وہاں آئین، قانون اور ریاستی ادارے افراد کے گرد گھومتے تھے۔

جب کہ حسین شہید سہر وردی کی پوری کوشش تھی کہ پاکستان میں ایک پارلیمانی جمہوری آئین بنے جس کے تحت ایسے ادارے معرضِ وجود میں آئیں جو پاکستان جیسے ملک کو نہ صرف متحد رکھ سکیں بلکہ اس کی تعمیر وترقی میں بھی موثر کردار ادا کر سکیں۔

علی نے براہ راست کبھی حسین شہید سہر وردی کو نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی اس کی ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی لیکن قانون ساز اسمبلی میں ان کی تقریروں کی روئیداد اخبارات میں وہ اتنے شوق سے پڑھتا تھا کہ ان کے افکار و نظریات اس کے ذہن کا حصہ بن چکے تھے۔

حسین شہید سہر وردی کا منفرد سیاسی سفر اور سیاسی افکار و نظریات بعض اوقات کئی حوالوں سے اسے قائد اعظم محمد علی جناح سے بھی زیادہ متاثر کرتے تھے۔ قائد اعظم متحدہ ہندوستان میں بلا شرکتِ غیرے مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے جن کی قیادت میں پاکستان بنا تھا لیکن ان کے آس پاس مسلمانوں میں کئی ایسے ستارے تھے جن کو قائد اعظم بوجوہ خود سے فاصلے پر رکھتے تھے۔

ان ستاروں میں دو ستارے ایسے تھے جنہوں نے قیام پاکستان میں قائد اعظم کی بھرپور مدد کی لیکن پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنی باقی ماندہ مختصر زندگی میں ان ستاروں کو خود سے دور رکھا۔ ان دوستاروں میں مغربی پاکستان میں سندھ کے جی ایم سید تھے اور مشرقی پاکستان سے حسین شہید سہروردی۔

پاکستان کے ان دو سپوتوں پر پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہندوستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا اور دونوں پر بتدریج مسلم لیگی سیاست کے دروازے بند کیۓ گیۓ۔

جی ایم سید نے سندھ میں مسلم لیگ کو ایک مقبول جماعت بنانے اور سندھ اسمبلی سے پاکستان کے حق میں ووٹ حاصل کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ یہی کردار بنگال میں حسین شہید سہروردی نے ادا کیا۔

پنجابیوں اور مہاجروں کے گٹھ جوڑ سے معرضِ وجود میں آنے والی اسٹیبلشمنت کے لیے نہ قوم پرست جی ایم سید قابل قبول تھے اور نہ قوم پرست حسین شہید سہروردی۔

حسین شہید سہروردی پر مسلم لیگ کے دروازے بند کیے گئے اور آئین ساز اسمبلی سے ان کی رکنیت ختم کی گئی تو انہوں نے مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ بنا کر 1954 میں مشرقی پاکستان میں ہونے والے الیکشن میں زبردست سیاسی کامیابی حاصل کی۔

سندھ اور مشرقی پاکستان میں اختلاف رائے رکھنے والے مسلم لیگیوں کے ساتھ جو سلوک ہوا سو ہوا لیکن سرحد میں باچا خان کی پارٹی کی حکومت بھی خود قائد اعظم کے حکم سے رخصت کی گئی۔

مشرقی پاکستان، سندھ اور سرحد میں یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو رہا تھا۔ پنجابی اور مہاجر گٹھ جوڑ سے معرض وجود میں آنے والی اسٹیبلشمنٹ کو جس لیڈر سے ہلکی سی مخالفت کے خطرے کی بو محسوس ہوتی تھی اس کو کسی نہ کسی طرح کسی بھی حکومتی ستون کے قریب آنے سے روک دیا جاتا۔

مشرقی پاکستان میں حسین شہید سہر وردی تو مقبول تھے ہی رفتہ رفتہ ان کے پارلیمانی جمہوریت اور سول آزادیوں پر غیر متزلزل اعتقاد کے بعد مغربی پاکستان میں بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ انہوں نے ایک منصوبے کے ساتھ پہلے وزیر قانون کی حیثیت سے پنجابی اور مہاجر اسٹیبلشمنٹ میں اپنے لیئے جگہ بنائی۔ اس کے بعد وزارت قانون چھوڑ کر قومی اسمبلی میں بطور اپوزیشن لیڈر آئین کو ایک جمہوری، پارلیمانی اور سول آزادیوں پر مبنی دستاویز بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ علی حسین شہید سہر وردی کے سول آزادیوں اور پارلیمانی جمہوریت کے بارے میں خیالات اور تصورات سے خاص طور پر بہت متاثر تھا۔

اس نے بہت پہلے یہ سمجھ لیا تھا کہ سول آزادیاں اگر افراد کی خداداد صلاحیتوں کو جلا دے کر ان کو ریاست کا اچھا شہری بننے میں مدد دیتی ہیں تو پارلیمانی جمہوری آئینی طرز عمل ان کو باہمی افہام تفہیم سے قومی سطح پر جنم لینے والے تضادات کے مناسب حل سے ریاستی معاملات چلانے کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتا ہے۔

اس حوالے سے گزشتہ چند سالوں میں حسین شہید سہر وردی نے جو کردار ادا کیا تھا وہ علی کے لیے قومی ہیرو کا درجہ اختیار کر چکے تھے۔ علی چاہتا تھا کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ حسین شہید سہر وردی کے ساتھ مل کر پاکستان کو ایک ایسی ماڈل ریاست بنانے کے لیے جدوجہد کرے گا جہاں پاکستانیوں کے خوابوں کی عملی تعبیر ممکن ہو سکے۔

لیکن فی الحال اس کی ساری توجہ کالج یونین کے پلیٹ فارم سے ایسے جلسے کے انعقاد پر مرکوز تھی جس کے ذریعے پاکستان کے طالب علموں کو ان اصولوں سے روشناس کرایا جا سکے جن پر عمل پیرا ہو کر وہ نہ صرف اپنے مستقبل کو روشن بنا سکیں بلکہ پاکستان کے مستقبل کو بہتر بنانے میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

فصل 9

کالج کے طالب علموں کی یونین نے جب کالج میں جلسے کا اعلان کیا تو حسین شہید سہروردی کے نام پر سارے شہر میں ہِل چُل مچ گئی۔

یوں تو کالج میں جلسے ہوتے رہتے تھے اور سیاسی پارٹیوں کے لیڈرانِ کرام اکثر ان جلسوں میں شرکت کرتے رہتے تھے لیکن یہ پہلی بار تھا کہ پاکستان کے ایک مقبول سابق وزیر اعظم جلسے میں تشریف لا رہے تھے۔

حسین شہید سہروردی ایک بڑا نام تو تھا ہی لیکن آئین و قانون کی عملداری کے لیے ان کی خدمات کی وجہ سے عوام کے دلوں میں جو ان کی عزت اور احترام تھا وہ کسی اور لیڈر کو میسر نہیں تھا۔ اور وہ بھی پاکستان کے دونوں حصوں میں۔

علی نے دوستوں کے ساتھ مشورے کے بعد جلسے کے لیے 7 اکتوبر 1958 کی سہ پہر کا وقت مقرر کیا۔ یہ تاریخ علی کو حسین شہید سہروردی نے خود دی تھی۔

حسین شہید سہروردی کی مصروفیات وزارت عظمیٰ سے فراغت کی بعد اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں بار کونسلیں، مزدور اور طلبا تنظیمیں اُنہیں اپنے جلسوں میں بطور مہمانِ خصوصی بلاتیں تو وہ شوق سے ان کے جلسوں میں شریک ہوتے اور ملک میں آئین اور قانون کی حکمرانی کے بارے میں حاضرین کو اپنے خیالات سے مستفید فرماتے۔

اپنے جلسوں میں وہ عوام کو اندرونِ خانہ چلنے والی سازشوں سے آگاہ کرتے اور اُنہیں بتاتے کہ ان سازشوں کو روکنے کا واحد طریقہ ملک میں آئین اور قانون کی حکمرانی میں مُضمر ہے۔

وہ قوتیں جو بالائے آئین و قانون ملک چلانا چاہتی تھیں ہمیشہ حسین شہید سہر وردی کو تنقید کا نشانہ بناتیں لیکن ان کی شدید تنقید کے باوجود وہ مسلسل بار کونسلوں، مزدور اور طلبا تنظیموں کے جلسوں میں سب پاکستانیوں کو دعوت دیتے کہ وہ آئین اور قانون کی حکمرانی اور اپنے حقوق کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

میئر شہر نے حسین شہید سہر وردی کی کالج یونین کے جلسے میں آنے کی خبر سن کر فوراً علی سے رابطہ کیا اور اُسے یقین دلایا کہ وہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے اور شہر میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے ہر طرح اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ تاہم اُنہوں نے علی کو متنبہ کیا کہ حسین شہید سہر وردی جہاں جاتے ہیں ان کی تقریروں سے عوام بے قابو ہو کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں جس سے نقصِ امن کے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔

وزارت داخلہ سے ہمیں پہلے ہی ہدایات جاری ہو چکی ہیں کہ ان کی آمد پر شہر میں کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہونے دی جائے اور حالات کو مکمل کنٹرول میں رکھا جائے۔

میئر شہر کے علاوہ شہر کی بار کونسل اور مزدور یونینوں نے بھی علی سے رابطہ کیا۔ بار کونسل اور مزدور یونین کے نمائندے چاہتے تھے کہ وہ الگ سے حسین شہید سہر وردی کے ساتھ ملاقات کریں اور اُنہیں اپنی مشکلات اور مسائل سے آگاہ کریں۔

علی نے واضح طور پر بار کونسل اور مزدور یونین کے نمائندوں کو بتادیا کہ جلسہ صرف ایک ہو گا اور وہ بھی کالج کے احاطے میں۔ اگر وکلا حضرات اور مزدور یونین کے ممبران کالج کے جلسے میں آنا چاہیں تو انہیں خوش آمدید کہا جائے گا لیکن اُنہیں طالب علموں سے الگ جگہ دی جائے گی اور ان میں سے کسی کو اسٹیج پر نہیں آنے دیا جائے گا۔ تاہم اگر ان کے وفود الگ سے حسین شہید سہر وردی صاحب سے ملنا چاہیں تو اس کا انتظام واہتمام کر دیا جائے گا۔

بار کونسل اور مزدور یونین کے نمائندوں نے علی کی اس بات سے اتفاق کیا۔ انہوں نے علی کو یقین دہانی کرائی کہ اگر جلسے کے انتظام میں اسے کسی قسم کی مدد درکار ہو تو وہ بخوشی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔

میئر شہر کو جب بار کونسل اور مزدور یونین کے نمائندوں کے ساتھ علی کی ملاقات کی تفصیلات کا پتہ چلا تو وہ پھر علی سے ملنے چلے آئے۔ انہوں نے علی کو سمجھانے کی کوشش کہ وہ بار کونسل اور مزدور یونین کے نمائندوں کو جلسے سے الگ رکھے۔

ان کا کہنا تھا کہ طالب علم، وکلا اور مزدور معاشرے کے الگ الگ حصے ہیں اور ان کا مل کر جلسے میں شامل ہونا شہری حکومت کے لیے انتظامی مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔

علی کا کہنا تھا کہ وکلا، مزدور اور طالب علم ایک ہی معاشرے کا حصہ ہیں انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ پاکستانی معاشرے کو جو مسائل درپیش ہیں وہ تنہا وکلا، مزدوروں یا طالب علموں کے مسائل نہیں بلکہ سب کے مشترکہ مسائل ہیں۔ معاشرے کے سب طبقے ان مسائل سے ایک ہی طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

میئر صاحب کی تسلی کے لیے علی نے انہیں بار کونسل اور مزدور یونین کے نمائندوں سے ہونے والی اپنی گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ بار کونسل یا مزدور یونین الگ سے اپنے جلسے نہیں کریں گے۔ کالج کے جلسے میں بار کونسل، مزدوروں اور طالب علموں کے لیے الگ الگ جگہیں ہوں گی۔ اسٹیج پر مکمل کنٹرول طالب علموں کا ہو گا اور ان کے نمائندوں کے علاوہ اسٹیج پر کسی کو جگہ نہیں دی جائے گی۔

علی کی وضاحت سے میئر صاحب کچھ مطمئن ہوئے کچھ نہ ہوئے۔ انہوں نے علی کو واضح طور پر بتا دیا کہ پہلے وہ سابق وزیر اعظم کی سکیورٹی کے لیے پولیس کی مختصر نفری لانا چاہتے تھے لیکن بار کونسل اور مزدور یونین کے ممبران کے جلسے کا حصہ بننے کے بعد وہ مجبور ہیں کہ وہاں پولیس کی زیادہ بڑی نفری لگائیں۔ علی نے میئر صاحب کو بتا دیا کہ اُسے پولیس کی زیادہ نفری کی وہاں موجودگی سے کوئی مسئلہ نہیں۔ تاہم اس نے میئر صاحب پر واضح کر دیا کہ اِس سلسلے میں وہ پرنسپل صاحب کو اعتماد میں لے لیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پرنسپل صاحب پولیس کی کالج کے اندر تعیناتی پر کسی قیمت پر راضی نہیں ہوں گے۔ اس صورت میں

وہ طالب علموں کی ایک رضاکار ٹیم تشکیل کرے گا جو پولیس کے ساتھ مل کر جلسے کو مکمل طور پر پُرامن رکھنے کی ذمہ دار ہو گی۔

جیسے جیسے جلسے کے دن قریب آ رہے تھے شہر میں جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ بات کالج سے نکل کر بار، بار سے مزدور یونینوں اور پھر عوام تک پہنچ چکی تھی۔

لوگوں میں حسین شہید سہروردی کی حکومت کے خاتمے کی وجہ سے پہلے ہی اشتعال موجود تھا۔ ان کی سیاسی بنیادیں چونکہ مشرقی پاکستان میں تھیں اس لیے مغربی پاکستان میں ان کی حکومت کے خاتمے پر زیادہ ہلچل نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں میں ایک تاثر عام تھا کہ پاکستان میں اقتدار پر قابض قوتیں کسی وجہ سے کسی ایسے شخص کو حکومت میں نہیں دیکھنا چاہتیں جس کی سوچ عوامی مفادات سے ہم آہنگ ہو۔

حسین شہید سہروردی نے اپنے عمل سے بار بار یہ چیز عوام کے دلوں پر نقش کر دی تھی کہ وہ نہ صرف عوامی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اُنہیں جہاں کہیں حکمران طبقوں اور عوام کے مفادات میں ٹکراؤ دکھائی دیتا ہے وہ ہمیشہ عوام کی طرف داری کرتے ہیں۔

ان کی شہر میں آمد کی خبروں کی وجہ سے شہر کے زیادہ سے زیادہ عمائدین علی سے رابطہ کر کے کسی نہ کسی طرح کالج کی تقریب میں حصّے دار بننا چاہتے تھے لیکن علی کا سب کو ایک ہی جواب تھا کہ وہ کالج یونین کی دعوت پر وہاں آ رہے ہیں اس لیے ان کی شہر میں آمد و رفت کالج یونین کے پروگرام کے مطابق ہو گی اور اس میں کسی قسم کی نہ تبدیلی کی جائے گی اور نہ کسی کو رخنہ اندازی کی اجازت دی جائے گی۔

لیکن 7 اکتوبر کے دن جب گیارہ بجے کے قریب حسین شہید سہروردی کی گاڑی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکی تو معاملہ مکمل طور پر مختلف تھا۔ عوام کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ریلوے اسٹیشن کے باہر اُن کے استقبال کے لیے موجود تھا۔

عوام کو ریلوے اسٹیشن پر لانے میں نہ کالج یونین شامل تھی، نہ بار کونسل اور نہ مزدور تنظیمیں، حسین شہید سہر وردی کی شہر میں آمد کی خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور لوگ خود بخود جوق در جوق اور ریلا در ریلا ریلوے اسٹیشن پہنچ رہے تھے۔

میئر شہر اپنی انتظامیہ کے دیگر اہم ارکان کے ساتھ پاکستان کے سابق وزیر اعظم کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے لیکن انہیں ہر گز توقع نہیں تھی کہ لوگ اس طرح دیوانہ وار ان کے استقبال کے لیے وہاں چلے آئیں گے۔

عوام کے جمِ غفیر سے پریشان ہو کر میئرِ شہر نے ایس پی صاحب کو شہر بھر کے تھانوں میں موجود نفری کو فوراً ریلوے اسٹیشن لانے کے احکامات جاری کیئے۔

حسین شہید سہر وردی ریلوے اسٹیشن سے باہر آئے تو اسٹیشن کے باہر سارا علاقہ حسین شہید سہر وردی زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔

پولیس پوری کوشش کر رہی تھی کہ ان کو گاڑی تک لے جائے لیکن عوام چاہتے تھے کہ حسین شہید سہر وردی ان سے خطاب کریں اور ملک کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالیں۔

عوام کا مطالبہ اور جوش و جذبہ دیکھتے ہوے میئرِ شہر اور علی نے چند لمحے باہمی گفتگو کے بعد فیصلہ کیا کہ ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ لاٹ میں ایک ہنگامی اسٹیج بنائی جائے اور حسین شہید سہر وردی وہیں عوام سے خطاب کریں۔

چند لمحوں میں اسٹیج تیار ہوا تو لوگوں کے فلک شگاف نعروں میں سانولے رنگ، درمیانے قد کے حسین شہید سہر وردی یوں اپنے بنگالی لب و لہجے کے ساتھ لوگوں سے مخاطب ہوئے۔

"عزیز ہم وطنو،

میں یہاں کالج یونین کی دعوت پر کالج کے جلسے میں شرکت کے لیے آیا ہوں لیکن ریلوے اسٹیشن پر آپ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد اور ایسا جوش وخروش دیکھ کر آپ کا حکم بجالاتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔

پاکستان اس وقت سخت مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔ آئے روز غیر قانونی طریقے سے حکومتوں کی تبدیلی کی وجہ سے سارے ملک میں طوائف الملوکی پھیل رہی ہے۔

آپ نے اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ میں نے پہلے وزیر قانون، پھر آئین ساز اسمبلی میں بطور اپوزیشن لیڈر، اور پھر پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے پاکستان کو ایک آئین دینے کی کتنی کوشش کی۔

خدا کا شکر ہے کہ آخر کار ایک متفقہ وفاقی، جمہوری پارلیمانی آئین بن چکا ہے۔ یہ آئین آپ کے شہری حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کو وفاق میں برابری کے حقوق عطا کرتا ہے۔ اور وفاق کی تمام اکائیوں کو وفاقی حکومت میں نمائندگی کا موثر حق دیتا ہے۔

اگلے سال اس آئین کے تحت الیکشن ہونے جارہے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آئین کے تحت جو حکومت بھی برسر اقتدار آئے گی وہ پاکستان کو آپ کی امیدوں، امنگوں اور خوابوں کے مطابق ملک بنانے میں کامیاب ہو گی۔"

ابھی حسین سہروردی نے اتنی تقریر کی تھی کہ ایس پی صاحب نے آگے بڑھ کر ان کے کان میں کہا کہ صدر پاکستان اسکندر مرزا نے پاکستان میں مارشل لا نافذ کر دیا ہے۔ اور انہوں نے ہدایت کی ہے کہ آپ کو کسی پبلک سرگرمی میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔

میں آپ سے انتہائی ادب سے معذرت چاہتا ہوں کہ اب نہ آپ یہ جلسہ جاری رکھ سکتے ہیں اور نہ کالج یونین کے جلسے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

اب آپ کو یہیں سے ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ ہم وزارت داخلہ کے مزید احکامات کا انتظار کر رہے ہیں۔ جیسے ہی ان کی طرف سے احکامات ملیں گے ان کی روشنی میں ہم آپ کو ان کی مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیں گے۔

عوام نے ایس پی صاحب کو حسین شہید سہروردی کے کان میں گفتگو کرتے سنا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُنہیں نظر آیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے جس کی وجہ سے وہ بے چین ہو گئے۔

حسین شہروردی نے اپنی تقریر کے موضوع سے ہٹ کر لوگوں کو پر امن رہنے کی درخواست کرتے ہو کہا۔ "مجھے ابھی ایس پی صاحب نے بتایا ہے کہ اسکندر مرزا نے پاکستان میں مارشل لا لگا دیا ہے۔ آئین معطل کر دیا ہے اور ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی ہے۔ مارشل لا احکامات کے تحت ملک میں نہ کہیں جلسہ ہو سکتا ہے نہ جلوس نکل سکتا ہے۔"

حسین شہید سہروردی کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آئے عوام، کالج یونین، بار کونسل اور مزدور یونینوں کے نمائندوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو ان کے جذبات بھڑک اٹھے۔

اُنہوں نے حکومت کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی۔ ایس پی صاحب نے حسین شہید سہروردی کو جلدی سے اپنی جیپ میں بٹھایا اور کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے اور جاتے جاتے اپنے ڈپٹی کو عوام کو منتشر کرنے کے لیے مناسب اقدامات کے احکامات دیتے گئے۔

فصل 10

اِدھر ریلوے اسٹیشن پر یہ ڈرامہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف کالج میں طلبا جلسہ گاہ میں حسین شہید سہروردی کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ کالج میں قائدِ جمہوریت حسین شہید سہروردی کا شایانِ شان استقبال کرنا چاہتے تھے۔

جب اُنہیں ریلوے اسٹیشن پر ہونے والے ڈرامے کی خبر ملی تو اُن کا جلسہ بلوے میں تبدیل ہو گیا۔ جس کے ہاتھ جو آیا لیکر کالج سے نکل پڑا۔ وہ بسیں، گاڑیاں اور دوکانیں جلاتے اسمبلی ہال کی طرف چل نکلے۔ راستے میں پولیس نے کئی جگہ اُنہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ آتش فشاں سے امڈنے والے لاوے کی طرح بڑھے چلے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ریلوے اسٹیشن پر حسین شہید سہروردی کے استقبال کے لیے اکٹھے ہونے والے عوام بھی کالج کے طلبا کے ساتھ شامل ہو گئے۔

میئرِ شہر خواجہ احسن صاحب نے بذاتِ خود مظاہرین کے پاس جا کر انہیں پر امن رہنے کی استدعا کی لیکن عوام بپھرے ہوئے تھے وہ کسی کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

رہی سہی کسر ریڈیو پر صدر پاکستان اسکندر مرزا کے مارشل لا لگانے کے بیان نے پوری کر دی تھی۔ ان کی تقریر کے نتیجے میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں لوگ آگ کی طرح بھڑک اٹھے۔

وہ عوام جو کئی سالوں کی طوائف الملوکی، آئے وقت حکومتوں کے ٹوٹنے بننے سے نالاں، ملک میں آئین بننے کے بعد بہتری کی امید لگائے بیٹھے تھے، اسکندر مرزا کا مارشل لا ان پر بجلی بن کر گرا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سالہا سال کی محنت کے بعد اگر ایک آئین بن گیا تھا اور اس کے تحت ایک نظام حکومت تشکیل پانے جا رہا تھا تو صدرِ پاکستان نے ملک میں مارشل لا لگا کر کس کی خدمت کی تھی؟

ریڈیو پاکستان پر ملک کے دونوں حصوں میں بھڑکنے والے فسادات اور بلووں کی خبریں تو سنسر کی جانے لگیں تھیں لیکن کراچی، لاہور، پشاور، ڈھاکہ اور چٹاگانگ سے چھپنے والے تمام بڑے اخبار دن میں کئی کئی بار اسپیشل ضمیمے چھاپ کر عوام کو تازہ ترین صورت حال سے باخبر رکھ رہے تھے۔

چھوٹے شہروں میں بھی یہی صورت حال تھی۔ سیالکوٹ، لائلپور، ملتان، راولپنڈی اور کوئٹہ کے اخبارات بھی بڑے شہروں کے اخبارات سے پیچھے نہیں تھے۔

شہر بہ شہر لوگوں کے جلسوں، جلوسوں اور گھیراؤ جلاؤ سے ملک کا سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ بسوں اور ٹرکوں کے مالکان نے اُنہیں جلائے جانے کے خوف سے محفوظ مقامات پر کھڑا کر دیا تھا۔

سکول اور کالج بند کر دیئے گئے۔ لیکن ہنگامے تھے کہ رُکنے میں نہیں آرہے تھے۔ لگتا تھا کہ کسی خفیہ منہ نے سارے پاکستانیوں کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اگلے تین ہفتوں تک اُنہیں ملک میں لاقانونیت کا بازار ہر قیمت پر گرم رکھنا ہے۔

اگر کسی شہر میں گھیراؤ اور جلاؤ کے واقعات کچھ تھمنا شروع ہوتے تو کوئی نادیدہ ہاتھ کسی اور شہر میں آگ بھڑکا دیتا اور پھر تشدد کی ایک نئی لہر باقی شہروں کو دوبارہ اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

ایک شہر میں ایسے پُر تشدّد واقعات رونما ہوتے تو دوسرے شہروں میں جواباً اس سے زیادہ شدید ردعمل ظاہر ہوتا۔

تین ہفتوں میں صورت حال اس قدر کشیدہ ہو گئی کہ ملک کا کاروبار تقریباً ختم ہو گیا۔ حکومت نام کی کوئی چیز ملک میں باقی نہ رہی۔ کسی کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ تشدّد کی یہ لہر کہاں جا کر رکے گی اور ملک بھر میں زندگی کس طرح دوبارہ نارمل ہو گی۔

جب ملک میں اس طرح کی صورت حال چل رہی تھی مسلح افواج کے سربراہ ایوب خان کو اپنے خوابوں کی تعبیر دن بدن قریب سے قریب تر آتی محسوس ہو رہی تھی۔

ملک پر فوج کے قبضے کی کئی اسکیمیں ماضی میں سامنے آچکی تھیں جنہیں کامیابی کے ساتھ روکا بھی جاچکا تھا۔ لیکن اس بار حالات کو اس ڈھب پر لے جایا جارہا تھا کہ اگر فوج کو مداخلت کرنی پڑے تو عوام اسے سازش کی بجائے نجات دھندگی کے عمل کے طور پر دیکھیں۔

ایوب خان کے چند ساتھی جرنیلوں نے ان کے لیے ملک کو ٹیک اوور کرنے کا پلان پہلے ہی مرتب کررکھا تھا۔

سیاست دانوں کی فہرست بنائی جاچکی تھی اور اس بات کا پیشگی اندازہ بھی کرلیا گیا تھا کہ کون ساسیاست دان کس ردعمل کا مظاہرہ کرے گا اور اس سے کس طرح نپٹا جائے گا۔ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے چند قوم پرست لیڈروں کے علاوہ مغربی پاکستان میں سیاست دانوں کی ایک طویل فہرست تھی جن سے توقع تھی کہ وہ نہ صرف فوج کے ملک پر قبضے کو خوش آمدید کہیں گے بلکہ ضرورت پڑی تو دست تعاون بھی پیش کریں گے۔

مشرقی پاکستان میں شدید ردعمل کی توقع تھی۔ خاص طور جن سیاست دانوں سے زیادہ سخت ردعمل کی توقع تھی ان میں سرفہرست حسین شہید سہروردی، مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمن کے نام تھے۔

کراچی میں بیٹھے حکمرانوں کو ویسے بھی ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی سڑکوں پر چلنے والا ہر بنگالی شرنار تھی نظر آتا تھا جو ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔

اسکندر مرزا نے اگرچہ مارشل لا نافذ کرتے وقت ایوب خان کو مارشل لا ایڈمنسٹریڑ مقرر کردیا تھا لیکن مارشل لا ایڈمنسٹریڑ کا اصل کام 27 اکتوبر کی رات اس وقت شروع ہوا جب ایوب خان کے چند ساتھی جرنیلوں نے اسکندر مرزا سے استعفی پر دستخط کرا کے اُسے انگلستان روانہ کیا اور جنرل ایوب خان نے بطور صدر قوم سے ریڈیو پر پہلا خطاب کیا۔

"عزیز ہم وطنو

گزشتہ کئی سالوں سے ملک میں سیاسی افراتفری چل رہی تھی۔ افواج پاکستان نے اپنے طور پر پوری کوشش کی کہ ملکی حالات سُدھر جائیں۔ لیکن سیاست دانوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے حالات روز بروز بدسے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ پورے ملک میں لاقانونیت اور طوائف الملوکی پھیل چکی ہے۔ ان حالات میں افواج پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کو صحیح جمہوری راستے پر ڈالا جائے۔

انشا اللہ افواج پاکستان بہت جلد پاکستان کے عوام کو ایسا جمہوری نظام دیں گی جس کے ذریعے صحیح معنوں میں ان کی نمائندگی ہو سکے گی۔

آپ جانتے ہیں کہ گزشتہ کئی دنوں سے ملک میں بلوہ اور گھیراؤ جلاؤ چل رہا ہے اس لیے پورے ملک میں غیر معینہ مدت تک کرفیو نافذ کیا جاتا ہے۔ اس دوران مسلح افواج کے دستے تمام شہروں کی سڑکوں پر گردش کرتے رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ امن امان قائم کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔ اللہ آپ کا حامی وناصر ہو۔ پاکستان پائندہ باد۔"

فصل 11

ملک میں کرفیو کی وجہ سے ہنگامے تھم گئے۔ بلوے ختم ہو گئے اور گھیر اؤ جلاؤ رک گیا۔ تاہم سوچ سمجھ رکھنے والے لوگ مارشل لا کے نفاذ سے دل گرفتہ اپنے گھروں کی بیٹھکوں میں چائے کی پیالیوں پر اکٹھے ہو کر ملکی معاملات پر بحث کرنا شروع ہو گئے۔

فوجی حکمران کالجوں پر خاص طور پر نظر رکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کالجوں کے طالب علم ایک بار سڑکوں پر نکل پڑے تو فوج کو اُنہیں روکنے کے لیے گولیاں چلانی پڑیں گی اور اگر ایک بار کسی جگہ گولیاں چل گئیں تو پھر شاید فوج کو جلد بیرکوں میں واپس جانا پڑے۔

جنرل ایوب خان جو کہ اتنے عرصہ سے اپنے دل و دماغ میں اقتدار کی خواہش پال رہے تھے اقتدار پر اس لیے قابض نہیں ہوئے تھے کہ چند ماہ میں بیرکوں میں واپس چلے جاتے۔ ان کے سامنے ایک بڑا ایجنڈہ تھا اور وہ پاکستان کے طول و عرض میں ایک ایسا نظام کھڑا کرنا چاہتے تھے جہاں ریاست کے سارے معاملات فوج کے ہاتھ میں ہوں اور سویلینز صرف جونیر پارٹنرز کی طرح فوج کی مدد کریں۔ لیکن
ڈرائنگ روموں میں چائے کی پیالیوں پر ہونے والی ملاقاتوں میں یہ سویلینز پاکستان کے مستقبل کے بارے میں فکر کا اظہار کرتے اور سوچ بچار کرتے کہ کس طرح فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجا جائے؟

علی بھی ان چند لوگوں میں سے تھا جن پر ایوب خان کے مارشل لا کی خبر بجلی بن کر گری تھی۔ مارشل لا نافذ ہوتے ہی اس نے شہر کے نوجوانوں سے رابطے شروع کر دیئے تا کہ اس چیلنج سے نپٹنے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔

اُسے اندازہ تھا کہ مارشل لا کے بعد مقامی کرنل کالج کے پرنسپل سے مسلسل رابطے میں تھا اور اکثر ان سے مل کر ان لڑکوں کی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہتا ہے جن کا کالج میں کسی بھی قسم کا اثر و رسوخ تھا۔

مارشل لا لگتے ہی پورے ملک میں ایوب خان کے احکام سے کالج تنظیموں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

کرنل صاحب نے ایک بار علی سے ملاقات کر کے اسے بھی وارننگ دی تھی کہ وہ کالج میں کسی قسم کا کوئی اکٹھ نہیں دیکھنا چاہتے۔ کرنل صاحب نے علی پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ ہاسٹل میں بھی کوئی سیاسی میٹنگ نہیں ہونی چاہیئے۔

کرنل صاحب سے ملاقات کے فورا بعد علی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہاسٹل چھوڑ دے گا اور کسی ایسی غیر معروف جگہ پر منتقل ہو جائے گا جہاں وہ دوستوں کے ساتھ مل کر ملکی و غیر ملکی حالات پر گفتگو کر سکے اور پاکستان کو درپیش مارشل لا جیسے نئے چیلنج سے نجات دلائی جا سکے۔

اتفاق سے کالج سے چند میل دور اسے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر مل گیا۔ وہ فوراً ہاسٹل سے وہاں منتقل ہو گیا۔

گھر میں صرف ایک سونے کا کمرہ، ایک ڈرائنگ روم اور ایک چھوٹا سا کچن تھا۔ گھر کی تعمیر کچھ اس انداز میں کی گئی تھی کہ یہ چھوٹا ہونے کے باوجود، روشن، ہوادار اور آرام دہ تھا۔

بیڈ روم کافی چھوٹا تھا۔ صرف دو تین افراد آسانی سے سو سکتے تھے۔ لیکن ڈرائنگ روم کشادہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں با آسانی صوفوں اور کرسیوں پر پندرہ بیس بندے بیٹھ سکتے تھے۔ سونے کے کمرے اور ڈرائنگ روم کے درمیان ایک برآمدہ تھا جہاں کھلے میں چند لوگ بیٹھ کر چائے پی سکتے اور گپ شپ کر سکتے تھے۔ برآمدے سے متصل کچن تھا جس میں گیس کے ایک چولہے اور برتن رکھنے والی چند الماریوں کے سوا خدا نام کی کوئی اور چیز نہیں تھی۔ اگرچہ کالج کے ہاسٹل کے کمرے سے یہ گھر بڑا تھا اور آنے جانے والوں کے بیٹھنے کے لیے الگ سے ایک ڈرائنگ روم بھی موجود تھا لیکن کالج کے ہاسٹل میں کمرے کے سامنے بڑا سا لان اور لان میں کیاریوں میں کھلے پھولوں کی کمی علی کو شدت سے محسوس ہوتی۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے ڈرائنگ روم اور برآمدے کے درمیان پھولوں کے گملے رکھوا دیے تاکہ وہ چند برسوں میں ہاسٹل کے جس سین سے آشنا ہو چکا تھا اس کا کچھ تاثر اس چھوٹے سے گھر میں موجود رہے۔

ہاسٹل سے اس گھر میں منتقل ہونے میں اس کے قریبی دوستوں نے اس کی مدد کی ۔

سبھی کو وہ گھر پسند تھا۔ اب وہ سارے ہاسٹل کے کمرے میں اکھٹا ہونے کی بجائے سرِشام اس گھر میں جمع ہو جاتے۔ چائے بنتی، صبح اور شام کے اخباروں کی خبروں پر بھرپور تبصرہ ہوتا۔ پھر مل کر کھانا بناتے اور رات گئے دیر تک بیٹھ کر پاکستان کے حالات کے بارے میں غور و فکر کرتے۔

اس دوران ان کا تدریسی سال ختم ہوا اور وہ سب امتحان سے فارغ ہو کر زیادہ وقت اکھٹا گزارنے لگے۔

اظہر کبھی کبھار دیکھ بھال کے لیے اپنی زمینوں پر چلا جاتا اور چند دن غائب رہتا لیکن باقی سارے دوست وہیں شہر میں ٹکے رہتے۔

تعلیم سے فراغت ملی تو سب کو اپنے مستقبل کی فکر شروع ہوئی۔ علی چاہتا تھا کہ اس کا گروپ منتشر نہ ہونے پائے چنانچہ ایک شام اس نے صفدر شاہ، خالد شیخ، سلیم موٹے اور اظہر سے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ مل کر ایک اخبار نکالیں جس میں لوگوں کو مارشل لا کے مضمرات، بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی اور سیاسی کج فکری کے معاملات سے باخبر کیا جائے۔ اور اپنا دائرۂ اثر بڑھا کر ملک میں سیاسی تبدیلی کی راہ ہموار کی جائے۔

تقریباً سبھی دوستوں نے اس بات پر اتفاق کیا۔ اور اس بات پر غور کرنے لگے کہ اخبار کیسے نکلے گا۔ اخبار چھپوانے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے ؟ کون کیا لکھے گا؟ اخبار شہر میں تقسیم کون کرے گا؟ اور اخبار کے دن بدن کے معاملات کون چلائے گا؟

اخبار نکالنے کے منصوبے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد سب دوستوں نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے لیے ذمہ داریاں مختص کیں۔

اخبار نکالنے کے منصوبے میں مشکل ترین کام اخبار کی عوام میں تقسیم تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ چند دن تک تو یہ کام کر پائیں گے لیکن فوجیوں کی موجودگی میں زیادہ عرصہ تک عوام میں اخبار کی تقسیم ممکن نہیں ہو گی۔

اس کے علاوہ اخبار کی اشاعت کے بارے میں بھی تمام دوستوں میں کسی ایک پریس پر اتفاق نہیں ہو رہا تھا۔ سب کے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ کون جمہوریت کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنا کاروبار داؤ پر لگائے گا۔

اخبار کی اشاعت کا مسئلہ صفدر شاہ نے یہ کہہ کر حل کر دیا کہ وہ ایک بنگالی پریس مالک کو جانتا ہے۔ بنگالی سیاسی سوچ میں ہم مغربی پاکستانیوں سے کہیں زیادہ جمہوریت پسند اور عوامی عملداری کے حامی ہیں۔ صفدر شاہ کو پوری توقع تھی کی بنگالی پریس کا مالک ان کے لیے اخبار کی اشاعت کے لیے تیار ہو جائے گا۔

جہاں تک اخبار کے نام کا تعلق تھا سب دوستوں نے باہمی مشورے سے آزاد پاکستان کے نام سے اخبار جاری کرنے پر اتفاق کیا تھا۔

سب کا خیال تھا کہ پاکستان اگرچہ برطانوی سامراج سے ظاہراً آزاد ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس میں کچھ ایسے مکڑے بیٹھے ہیں جو ہر وقت سازشوں کے جالے بُن کر اس ملک میں اپنے آقاؤں کے سامراجی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ ایوب خان کا مارشل لا بھی ایسا ہی ایک جال تھا جس میں پاکستان کو آہستہ آہستہ مکھی کی طرح جکڑا جا رہا تھا تا کہ جب ضرورت محسوس ہو اس کو تر نوالہ بنایا جا سکے۔

علی اور اس کے سب دوست چاہتے تھے پاکستان کو تمام ایسے جالوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ یہ کام کسی طور بھی عوام کی بھرپور شرکت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

مشرقی پاکستان میں حسین شہید سہروردی اور مولانا بھاشانی نے لوگوں میں خاصی حد تک جمہوری شعور اور انقلابی سوچ پیدا کر دی تھی لیکن مغربی پاکستان میں ایسا شعور اور ایسی سوچ پیدا کرنے کی سخت ضرورت تھی۔

اور اس مقصد کے لیے اخبار سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علی کالج سے فارغ ہونے کے بعد دوستوں کے ساتھ مل کر اخبار نکالنا چاہتا تھا۔

لیکن مارشل لا کے بعد پریس پر لگنے والی پابندیوں کی موجودگی میں اخبار جاری کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ لہذا وہ چاہتے تھے اخبار نکلے لیکن حکومتی ضابطوں کے بغیر اور وہ بھی ایسا اخبار جو عوامی خواہشات کو اس طرح سیاسی شعور میں ڈھالے جس سے پاکستان میں کوئی بڑی سیاسی تبدیلی لائی جاسکے۔

کالج کے ہاسٹل سے ایک چھوٹے سے نامعلوم جگہ پر واقع گھر میں منتقل ہونے کے بعد علی اوراس کے دوستوں کو یہ خواب پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

اپنے خوابوں کی تکمیل کے راستے میں حائل مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے وہ سب پوری طرح تیار تھے۔ دریاؤں میں اٹھنے والے طوفان فولادی بازووں والے تیراکوں کو جب دعوت مبارزت دیتے ہیں تو وہ بے خوف ان میں کود جاتے ہیں۔ علی اور اس کے دوستوں نے بھی درپیش مشکلات کے باوجود فیصلہ کیا کہ آزاد پاکستان کا اجرا ہوگا اور وہ بھی حکومتی پابندیوں اور قانونی موشگافیوں کے باوجود۔ ان کا خیال تھا اگر پاکستان بنا ہے تو اسے آگے بھی بڑھنا چاہیے ایک آزاد، باوقار اور خوشحال ملک کی طرح۔

فصل 12

آزاد پاکستان کی اشاعت کا پلان تیار کرنے کے بعد سب نے فیصلہ کیا کہ اس کا اجرا شروع ہونے والے نئے سال کی آمد پر کیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد علی اور اس کے دوست اخبار کی اشاعت کے معاملات سرانجام دینے میں جُت گئے۔

صفدر شاہ پہلے ہی بنگالی پریس کے مالک سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ ان کے اخبار کی اشاعت کا اہتمام کرے گا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ علی کے دوستوں میں سے کوئی اس کے پریس کے آس پاس دکھائی دے۔

اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اخبار کا مٹیریل اس تک کسی وسیلے سے پہنچا دیا کریں تو وہ مقررہ وقت پر ان کا اخبار چھاپے گا اور پھر وہ کسی غیر محسوس طریقے سے اخبار کی کاپیاں اس کے پریس سے اٹھوا لیا کریں۔ مٹیریل کے پریس تک آنے اور اخبار کی کاپیاں اٹھانے کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیئے۔

صفدر شاہ نے دوستوں کو جب بنگالی پریس کے مالک سے ہونے والے بندوبست کا ذکر کیا تو سب کے چہرے خوشی سے کِھل اُٹھے۔ اخبار کی اشاعت کا ایک اہم مرحلہ طے پانے کے بعد باقی معاملات کے ساتھ نپٹنا انہیں قدرے آسان دکھائی دیا۔

جب علی اور اس کے ساتھی اخبار کی اشاعت کے مرحلے طے کر رہے تھے حسین شہید سہروردی کو ملٹری حکومت نے سین سے غائب کر دیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ گاہے گاہے کہیں سے خبر ملتی کہ انہیں مشرقی پاکستان پہنچا دیا گیا ہے اور اب وہ ڈھاکہ کے باہر کسی گھر میں نظر بند ہیں۔ نہ کوئی ان سے مل سکتا ہے نہ رابطہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح مولانا بھاشانی اور مجیب الرحمان کو بھی ان کی رہائش گاہوں پر نظر بند کر دیا گیا۔ ملٹری حکومت مولانا بھاشانی اور مجیب الرحمان سے زیادہ خوف زدہ

نہیں تھی کیونکہ ان کا اثر مشرقی پاکستان تک محدود تھا اور مغربی پاکستان میں ان کے زیادہ پیروکار نہیں تھے۔ لیکن حسین شہید سہروردی کی بات اور تھی۔

ان کی پیروی کرنے والے اگر مشرقی پاکستان میں بہت زیادہ تھے تو ان سے محبت کرنے والوں کی مغربی پاکستان میں بھی کمی نہیں تھی۔ مغربی پاکستان میں بھی حسین شہید سہروردی جہاں جاتے ہزاروں کا مجمع ان کی بنگالی نما اردو تقریریں سننے کے لیے اکٹھا ہو جاتا۔ ان کا پیغام اتنا طاقت ور تھا کہ ان کی تقریروں سے مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، وکیلوں اور عام آدمیوں کی زندگیاں جوش و جذبے سے بھر جاتیں اور وہ اپنی قسمت اپنے ہاتھوں میں لینے کے خواب دیکھنے لگتے۔

یہی خواب تھے جو علی اور اس کے دوستوں کے دل و دماغ میں کالج کے دنوں میں رچ بس گئے تھے اور اب ان خوابوں کو حقیقت کا روپ عطا کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے پر آمادہ تھا۔

علی کے والد چوہدری محمد حسین کا خیال تھا کہ علی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی گاؤں واپس لوٹ آئے گا۔ اوراب تک چلی آتی خاندانی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمینوں کا کاروبار چلانے میں ان کی مدد کرے گا۔

لیکن علی کے دل اور دماغ میں جو خواب آگ کا الاؤ بن کر دہک رہے تھے وہ زمینداری کے کاروبار سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ ویسے بھی علی زمین کی ملکیت کے تصورات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار پر ان لوگوں کا حق پہلے ہے جو اس پر محنت کرتے ہیں۔ باقی سب بعد میں آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود کبھی خاندانی زمینداری کے بارے میں متفکر نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب زمینداری کا بوجھ اس کے کندھوں پر پڑے گا تو اسے اس سے کس طرح عہدہ برآ ہونا ہے۔

چوہدری محمد حسین صاحب کو جب پتہ چلا کہ علی نے شہر میں ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا ہے تو وہ پریشانی میں اسے ملنے شہر چلے آئے۔
میئر شہر کے ذریعے انہوں نے پہلے سے پتہ کروالیا تھا کہ علی نے شہر میں گھر کہاں کرائے پر لیا ہے۔ مسلسل ہاسٹل میں آتے جاتے رہنے کی وجہ سے وہ علی کے دوستوں سے بھی خوب آشنا تھے۔
جب چوہدری حسین شہر میں علی کے گھر پر پہنچے تو وہ اپنے سب دوستوں سمیت گھر پر ہی موجود تھا۔ اس نے بڑے چوہدری صاحب کو اس طرح بغیر اطلاع اپنے درمیان پایا تو اس نے ہلکے سے تعجب کے اظہار کے بعد اس اُنہیں محبت کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ پہلے چائے پانی کا پوچھا اور پھر آنے کا مقصد دریافت کیا۔
چوہدری صاحب نے بلا کم و کاست اپنے آنے کا مدعا بیان کیا: "علی تم جانتے ہو تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو۔ تم نے شہر آکر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کی تو ہم نے اعتراض نہیں کیا۔ تم ہاسٹل میں منتقل ہوئے تو ہمیں کچھ ملال ہوا لیکن ہم نے تمہاری خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ اب تم نے یہاں گھر کرائے پر لیا ہے تو ہمیں فکر ہونے لگی ہے کہ تم کس طرف جارہے ہو۔"
" میں کسی طرف نہیں جارہا۔ یہیں شہر میں رہ کر دوستوں کے ساتھ کچھ منصوبوں پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ ویسے بھی آپ کے ہوتے ہوئے گاؤں میں سارے کام ٹھیک طریقے سے چل رہے ہیں۔ اگر کبھی آپ کو شدّت سے میری ضرورت محسوس ہوئی تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوراً گاؤں پہنچ جاوں گا۔"
علی کے جواب سے بڑے چوہدری صاحب کچھ مطمئن ہوئے کچھ نہ ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ علی اب شہر کو خدا حافظ کہے اور گاؤں میں زمینداری سنبھالے۔ ساتھ ہی وہ چاہتے تھے کہ علی کی کسی مناسب خاندان میں شادی کریں تاکہ زمینداری کے ساتھ خاندانی وراثت کا سلسلہ چلتا رہے۔

شادی کے مسئلے پر علی نے بڑے چوہدری صاحب سے کہا کہ وہ اس کی فکر نہ کریں۔ جب اسے کوئی مناسب لڑکی دکھائی دے گی وہ خود اُنہیں بتا دے گا اور وہ اس سے اس کی شادی کا بندوبست کر دیں۔ بڑے چوہدری صاحب چاہتے تھے کہ علی کی شادی علاقے کے دوسرے بڑے زمیندار چوہدری فراغت حسین کی بیٹی سے ہو جائے۔ ان کے اپنے خاندان کی طرح چوہدری فراغت حسین کا بھی علاقے میں کافی اثر ورسوخ تھا اور حکومتی حلقوں میں بھی اُنہیں بھرپور رسائی حاصل تھی۔ ان کے خیال میں اگر یہ شادی ہو جاتی ہے تو علی کو اتنا اثر ورسوخ حاصل ہو جائے گا کہ نہ صرف وہ زمینداری کے معاملات آسانی سے چلا سکے گا بلکہ ان کے خاندان کا حکومتی معاملات میں عمل دخل بھی قائم رہے گا۔ وہ جانتے تھے کہ زمینداروں کے لیے حکمرانوں سے اچھا میل ملاپ قائم رکھنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔

علی نے نہایت سلیقے کے ساتھ بڑے چوہدری صاحب کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ وہ وہم نہ کریں وہ جیسا چاہیں گے وہ ویسے ہی کرے گا۔ لیکن وہ اسے کچھ وقت دیں تا کہ وہ شہر میں شروع کیے گئے اُدھورے کام مکمل کر سکے۔

بڑے چوہدری صاحب آنکھوں میں نمی لیے شہر سے رخصت ہوئے لیکن جانے سے پہلے میئرِ شہر کو مل کر کہتے گئے کہ وہ علی کا خیال رکھے اور اگر اسے کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہ نہ صرف اسے فراہم کرے بلکہ گاہے بگاہے انہیں اس کے احوال سے آگاہ کرتا رہے۔

بڑے چوہدری صاحب کی روانگی کے بعد علی اور اس کے دوست دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہوئے۔

اشاعت کا مسئلہ بنگالی پریس کے ذریعے طے ہو چکا تھا لیکن شہر میں اخبار کی ترسیل سے متعلقہ معاملات طے کرنا ابھی باقی تھے۔ سب دوست مل کر اس پر غور وفکر کر رہے تھے۔ علی کا خیال تھا کہ وہ سب مل کر شہر کے مختلف حصوں میں مرحلہ وار اخبار کی ترسیل کر سکتے ہیں۔

سلیم موٹے کا خیال تھا کہ چند نوجوان بچوں کی مدد حاصل کی جائے جو شائع شدہ اخبار بنگالی پریس سے اٹھا کر مخصوص مقاموں تک پہنچا دیا کریں اور پھر ہم وہ اخبار لوگوں میں بانٹ دیا کریں۔

اظہر کا خیال تھا کہ شہر میں تمام اخبار فروشوں سے رابطہ کیا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ ہر اخبار خریدنے والے کو یہ اخبار مفت میں ساتھ دے دیا کریں۔

ابھی علی اور اس کے دوست اخبار کی تقسیم و ترسیل کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے کہ میئرِ شہر کے کلرک نور حسین نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔

علی نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو نور حسین کو دیکھ کر متعجب ہوا۔

"کہو نور حسین کیسے آنا ہوا؟"

"میئرِ شہر نے کہا ہے اگر ممکن ہو تو آپ کل صبح نو بجے انہیں ان کے دفتر میں مل لیں۔"

علی نے نور حسین سے کہا وہ میئرِ شہر کا شکریہ ادا کرے اور انہیں کہہ دے کہ وہ کل صبح 9 بجے ان کے دفتر پہنچ جائے گا۔

نور حسین کے جانے کے بعد علی نے اپنے دوستوں کو اس کی آمد اور میئرِ شہر کی اس سے کل ملاقات کی خواہش کے بارے میں بتایا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف تعجب خیز نگاہوں سے دیکھا- میئرِ شہر کی عین اس وقت علی سے ملاقات کی خواہش کیا روزمرہ کی ملاقات تھی یا اس کے پیچھے کچھ اور کہانی تھی؟

وہ سب اخبار کے بارے میں گفتگو چھوڑ کر کل علی کی میئر سے متوقع ملاقات کے بارے سوچ و بچار میں کھو گئے۔

فصل 13

اگلے دن صبح علی بیدار ہوا تو سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہوا میں خاصی خنکی تھی۔ چاروں طرف دھند چھائی تھی۔ علی نے گرم پانی سے غسل کیا کپڑے بدلے اور میئر کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ اس کا خیال تھا راستے میں رک کر کسی قہوہ خانے سے چائے اور باقر خانیوں کا ناشتہ کرے گا اور پھر میئر کے دفتر پہنچے گا۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی تو ابھی صرف صبح کے سات بجے تھے۔ اس کے گھر سے میئر کے دفتر تک پیدل پندرہ بیس منٹ کا راستہ تھا۔

اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پیدل میئر کے دفتر جائے گا اور وہاں سے فارغ ہو کر شہر میں چند اخبار فروشوں سے ملے گا تا کہ اخبار کی اشاعت کے بعد اس کی تقسیم کے عمل کو باقاعدہ شکل دی جاسکے۔ میئر کے دفتر جاتے ہوئے علی کے ذہن میں کئی باتیں تھیں۔ بڑے چوہدری صاحب کے گاؤں واپس جاتے وقت اُن کی آنکھوں میں چُھپی نمی اس نے دیکھ لی تھی۔

اس کو اپنے ماں باپ سے محبت تھی اور اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کا خوب احساس تھا۔ والدین کی زندگی میں ہر انسان کے تحت الشعور میں اپنے ماں باپ کے ناقابل شکست ہونے کا احساس چُھپا ہوتا ہے۔ اس احساس کی وجہ سے وہ خود کو بھی ایک ناقابل شکست فرد کے طور پر دیکھتا ہے۔ لیکن ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد اسے زندگی کی ناپائداری کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ زندگی کو مختلف نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

پھر اسے حسین شہید سہروردی کی تقریریں یاد آرہی تھیں۔ کتنا یقین اور اعتماد ہے ان کی تقریروں میں ان کے لب ولہجے اور ان کے پیغام میں۔ کیا ہم واقعتاً پاکستان کو ایک ایسا ملک بنا سکتے ہیں جس پر جنگل کی بجائے ایک گلشن کا احساس ہو۔ جہاں ہر چیز اصول، قانون اور طور طریقے کے مطابق ہو۔

حکومت بنے تو کسی اصول کے تحت۔ حکمران آئیں اور جائیں تو کسی قانون کے تحت، کام ہوں تو کسی ضابطے اور طریقے کے ساتھ۔ اگر حسین شہید سہروردی کہتے ہیں کہ پاکستان میں آئین اور قانون کی حکمرانی ہونی چاہیئے، جمہور کو قومی فیصلوں پر اختیار ہونا چاہیئے ، ان کی رائے کا احترام ہونا چاہیئے، مزدوروں کو مزدور ہونے کی سزا نہیں ملنی چاہیئے بلکہ مزدوری ان کے لیے باعث افتخار ہونی چاہیئے، اور مزدوری سے ان کی زندگی کا کاروبار آسودگی کے ساتھ چلنا چاہیئے، تو کیا غلط کہتے ہیں؟ اس میں کیا برائی ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کے بچوں کو پڑھائی لکھائی اور ترقی کرنے کے وہی مواقع ملیں جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کے بچے کو ملتے ہیں؟

علی یہی باتیں سوچتا میئر کے دفتر کی طرف جارہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک چھوٹے سے بچے پر پڑی جو میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک فیکٹری کے باہر فیکٹری میں تیار ہونے والے سرجیکل آلات کو پالش کررہا تھا۔

اس بچے کو دیکھ کر علی کے قدم وہیں فیکٹری کے باہر رُک گئے۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑا اس بچے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ماں باپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے بھائی بہنوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

یہ سین اس نے پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئ بار اس نے ایسے سین دیکھے تھے۔

وہ ہمیشہ ایسے بچوں کے بارے میں سوچتا کہ ان کا مستقبل کیا ہے؟ ان کے مستقبل میں اسے پاکستان کا مستقبل دکھائی دیتا تھا۔ تاریک، خستہ اور غیر یقینی۔

ابھی فیکٹری کے باہر کھڑا وہ اس بچے کو انہماک کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اسے ایک نوجوان لڑکی فیکٹری سے باہر آتی دکھائی دی۔ فیکٹری کا مالک لڑکی کو انتہائی ہتک آمیز انداز میں فیکٹری سے چلے جانے کے لیے کہہ رہا تھا اور ساتھ ہی اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔

نوجوان لڑکی فیکٹری کے مالک کی بدزبانی کے باوجود انتہائی مہذب اور شستہ انداز میں اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کام پر نہیں لگا سکتا۔ یہ لیبر کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔

آج وہ اسے صرف زبانی وارننگ دے رہی ہے لیکن اگلی بار وہ کورٹ سے لیبر لاز کی خلاف ورزی کا وارنٹ لے کر پولیس کے ساتھ وہاں آئے گی اسے ہتھکڑیاں لگوا کر جیل بھجوائے گی۔

علی کو وہاں کھڑے دیکھ کر فیکٹری کے مالک نے اسے اس لڑکی کا ساتھی سمجھا اوراس کے ساتھ بد کلامی بند کر کے فیکٹری کے اندر چلا گیا۔

علی نے آگے بڑھ کر اس لڑکی سے فیکٹری کے مالک کی بد کلامی کی وجہ پُوچھی تو اس نے کہا یہ روز کا معمول ہے۔ اس نے علی کو بتایا کہ وہ ایک وکیل ہے۔ اس نے پچھلے سال لیبر لا میں ایل ایل بی کیا تھا اور اب وہ شہر کی فیکٹریوں میں جا کر فیکٹریوں میں ہونے والی بے ضابطگیوں پر ڈیٹا اکٹھا کرتی ہے۔ اور اگر اسے کہیں بے ضابطگیاں دکھائی دیتی ہیں تو وہ عدالت سے ایسے مالکوں کو نوٹس بھجواتی ہے۔

نوجوان لڑکی کی گفتگو سے علی کو کچھ راحت ملی۔ اس نے اس لڑکی سے اپنا تعارف کرایا۔ میرا نام علی حسین ہے۔ میں نے اسی سال گورنمنٹ کالج سے عمرانیات میں بی اے کیا ہے۔ میں اس سال کالج کی طلبا یونین کا صدر تھا۔ اب کالج سے فارغ ہونے کے بعد آپ سے کچھ ملتا جلتا کام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے یہاں کھڑے ہونے کی وجہ بھی فیکٹری کے باہر ٹھنڈ میں کام کرنے والا وہ بچہ تھا جس کے لیے آپ فیکٹری کے مالک سے اُلٹی سیدھی باتیں سن رہی تھیں۔

نوجوان لڑکی نے علی کی باتیں سنیں تو اس نے گہری نظروں سے علی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کو تعجب ہوا کہ ایک نکلتے ہوئے قد کا خوش لباس نوجوان جس نے انتہائی سلیقے سے اپنے بال بنا رکھے تھے اور لب و لہجے سے انتہائی شائستہ اور سلجھا ہوا کسی اچھے گھر کا لڑکا لگتا تھا کن باتوں کے بارے میں سوچتا تھا۔

اسے علی پہلی نظر میں اچھا لگا۔ اس نے چاہا کہ وہ علی کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرے اوراس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرے۔

اس نے علی سے کہا کہ اس صبح پہلے فیکٹری کے مالک سے ملاقات کے بعد اسے ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ وہ کہیں بیٹھ جائے اور چائے کا ایک کپ پیئے۔ کیا وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینی پسند کرے گا؟

علی نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو ابھی صرف صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ میئر کے ساتھ اس کی ملاقات میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ اور پھر اسے ابھی ناشتہ بھی کرنا تھا۔

اس نے کھلتے ہوئے رنگ والی خوبصورت نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا اور فوراً اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی حامی بھرتے ہوئے کہا: "آپ کے ساتھ چائے ضرور پیوں گا لیکن ایک شرط پر۔"

"اور وہ شرط کیا ہے؟" لڑکی نے محبت بھرے انداز میں سر کے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔

"شرط یہ ہے کہ اب آپ کو مجھے اپنا نام بتانا ہو گا۔"

"سوری میں بھول گئی تھی۔ میرا نام زرینہ ہے۔ اور کام کے بارے میں تو آپ جان ہی گئے ہیں۔" زرینہ نے چہرے پر ہلکی سی پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

فیکٹری سے تھوڑی دور ایک قہوہ خانہ تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے قہوہ خانے پہنچے اور ایک علحدہ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ قہوہ خانے میں بھی دو چھوٹے سے بچے جن کی سکول جانے کی عمریں تھیں کام کر رہے تھے۔

مالک انہیں بار بار چھوٹا یا چھوٹے کہہ کر بلاتا اور وہ بھاگ دوڑ کر کبھی گاہکوں کے سامنے پیالیاں اٹھاتے کبھی رکھتے اور کبھی پیالیاں صاف کر رہے تھے۔

علی نے زرینہ سے کہا: "اسے اس قہوہ خانے کے مالک کو بھی ایک نوٹس دینا پڑے گا۔"

"نہیں یہاں بیٹھ کر ہم صرف چائے پئیں گے، باتیں کریں گے، ایک دوسرے کو جانیں گے اور دیکھیں گے کہ ہم ایک دوسرے کے کام میں کیسے مدد کر سکتے ہیں۔"

علی کو زرینہ کی صاف گوئی اچھی لگی۔ اس کا سراپا پہلے ہی اس کے دل میں اتر چکا تھا۔

کھلی کھلی رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھوں، اور لمبے سیاہ بالوں والی زرینہ اسے پہلی نظر میں گھائل کر چکی تھی۔

اس کے علاوہ ان کے ایک جیسے خیالات اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی خواہش-دونوں آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کس طرح دوندیاں کن راستوں سے گزرتی کہاں آکر ایک دوسرے میں اچانک مدغم ہو رہی ہیں۔

چائے کے کپ ہونٹوں سے لگائے دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور جان لیا کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ لیکن دل کی بات نہ زرینہ نے علی سے کہی اور نہ علی نے زرینہ سے۔

"علی تم نے مجھے یہ تو بتایا ہے کہ تمہارا نام علی حسین ہے لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم اس طرح عمدہ لباس میں ملبوس اتنی صبح فیکٹری کے باہر کھڑے کیا کر رہے تھے۔ کیا کہ تم کہیں کام پر جا رہے تھے۔"

زرینہ نے اپنائیت سے علی سے پوچھا۔

"ہاں کام سے جا بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔" علی نے بھی اسی اپنائیت سے جواب دیا۔

"ارے یہ کیا جواب ہوا۔ کام سے جا بھی رہے تھے اور نہیں بھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کام سے جائے بھی اور نہ بھی جائے؟" زرینہ نے شوخی بھرے لہجے سے سوال کیا۔

"ہاں کام سے جا اس لیے رہا تھا کہ آج صبح نو بجے میئر سے ملاقات طے ہے۔ اور جا اس لیے نہیں رہا کہ اب آپ کو یہاں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"نہیں نہیں۔ علی تم میئر سے ضرور ملو۔ کون جانے وہ کوئی انتہائی ضروری بات تم سے کہنا چاہتے ہوں۔" زرینہ نے سنجیدگی کے ساتھ علی کو مشورہ دیا۔

دونوں چائے پی چکے تو زرینہ نے علی سے جانے کی اجازت چاہی۔ علی نے گھڑی کی طرف دیکھا تو انہیں وہاں بیٹھے تقریباً سوا گھنٹہ گزر چکا تھا۔

وقت بھی اپنی اڑان کی رفتار اس وقت تیز کر دیتا ہے جب اسے آہستہ چلنا چاہیئے اور اس وقت آہستہ ہو جاتا ہے جب اسے تیز چلنا چاہیئے۔

علی نے کہا: "ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔ لیکن یہ تو بتا دیں کہ اب ہم کب اور کہاں ملیں گے۔" "کیا دوبارہ ملنا

ضروری ہے؟" زرینہ نے شرارت آمیز لہجے میں علی سے سوال کیا۔

علی نے کوٹ کی جیب سے قلم اور کاغذ نکالا اور جلدی سے اس پر اپنا ایڈریس لکھتے ہوے کہا۔"اگر آپ کا دل کہے کہ دوبارہ ملنا ضروری ہے تو یہ میرا ایڈریس ہے۔ میں وہاں تنہا رہتا ہوں۔"

زرینہ نے ہاتھ آگے بڑھا کر علی کے ہاتھ سے ایڈریس لکھا کاغذ لے لیا۔ اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چل دی۔ وہ علی کے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں چاہتی تھی کہ میئر کے ساتھ اس کی ملاقات کا وقت گزر جائے۔

وہ سڑک پر تنہا چل رہی تھی لیکن اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ علی اب بھی اُس کے ساتھ چل رہا ہے۔

فصل 14

زرینہ کو خدا حافظ کہہ کر علی تیزی سے قدم اٹھاتا میئر کے دفتر پہنچا تو اس کی گھڑی کی سوئیاں ٹھیک نو بجا رہی تھیں۔

میئر کے اسٹاف کو علی کی آمد کی پہلے سے خبر تھی۔ چنانچہ میئر کے سکریڑی نے آگے بڑھ کر علی کے لیے دفتر کا دروازہ کھولا۔

خواجہ صاحب نے اپنی کرسی سے اٹھ کر علی کو خوش آمدید کہا اور علی سے بیٹھنے کی درخواست کی۔

علی اگرچہ میئر کے دفتر پہنچ چکا تھا اور میئر کے سامنے بیٹھا تھا لیکن اس کا ذہن زرینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میئر نے اس کی بے خیالی دیکھی تو کہا: "علی خیریت تو ہے۔ تم کچھ کھوئے کھوئے دکھائی دے رہے ہو؟"

علی نے چونک کر میئر کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ملاقات کے لیے بلانے کا مقصد دریافت کیا۔

میئر نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی بجائے علی سے کہا۔ کل مارشل لا کا سیکڑ انچارج کرنل ملنے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا تم لوگ کوئی اخبار جاری کرنے جا رہے ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ تم لوگ اخبار جاری نہ کرو۔

علی نے تعجب سے میئر کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا: "کرنل کو کیسے پتہ چلا ہے کہ ہم اخبار جاری کرنے جا رہے ہیں؟"

"وہ دو دن قبل بنگالی پریس گیا تھا۔ مارشل لا حکومت کا حکم ہے کہ ہر پریس کا مالک اپنے پریس میں چھپنے والی ہر چیز کی ایک کاپی پریس میں محفوظ رکھے۔ مارشل لا حُکام ہر ہفتے ہر پریس میں چھپنے والی ہر چیز کا معائنہ کریں گے۔ اور اگر حکومت کے خلاف ان کے پریس پر کوئی چیز چھپی تو اس کے مالک کو پانچ سال قید دی جائے گی اور دس ہزار روپے جرمانہ کیا جائے گا۔

بنگالی پریس کے مالک نے کرنل سے پوچھا تھا کہ نئے اخبارات یا میگزین چھاپنے کے بارے میں کیا احکامات ہیں۔ جس پر کرنل نے اسے بتادیا تھا کہ اب محکمہ اطلاعات کی باقاعدہ اجازت کے بغیر نہ کوئی نیا اخبار نکل سکتا ہے اور نہ کوئی نیا میگزین جاری ہو سکتا ہے۔ بنگالی پریس کے مالک نے کرنل کو بتایا تھا کہ تمہارا دوست صفدر شاہ تمہاری نگرانی میں جنوری میں کوئی نیا اخبار جاری کرنے جارہا ہے۔"

علی نے تحمل سے میئر کی گفتگو سنی اور پھر بلا کم و کاست میئر سے کہا کہ مارشل لا حکام کی انفارمیشن درست ہے کہ ہم اخبار جاری کرنے جارہے ہیں۔

"ہم چاہتے ہیں ہم عوام کو ایک ترقی پسند، جمہوری، پاکستان بنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کریں۔ چیزیں اس طرف جارہی تھیں لیکن فوج نے مارشل لا لگا کر پاکستان کی منزل کھوٹی کر دی ہے۔

ریڈیو پاکستان پر حکومت پاکستان کا قبضہ ہے۔ ریڈیو سے وہی بات نشر کی جاتی ہے جو حکومت چاہتی ہے کہ نشر کی جائے۔ عوام کی بات کہنے سننے کے لیے کوئی تیار نہیں۔

حسین شہید سہروردی جیسے لیڈر جو ملک کو صحیح راستے پر چلانا چاہتے تھے انہیں یا جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے یا گھروں میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔

کالجوں میں طلبا یونینوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ مزدوروں کی سب یونینیں خلافِ قانون قرار دے دی گئی ہیں۔ سارے فیصلے ملٹری کورٹوں میں کئے جارہے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم اپنی بات عوم تک پہنچانا چاہیں تو کیا کریں؟"

خواجہ صاحب نے علی کی باتیں سنیں تو ان کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔

"دیکھو علی میرے چوہدری محمد حسین صاحب سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے نور حسین کو بھجوا کر تمہیں اپنے دفتر میں بلایا ہے۔

تم جانتے ہو میرے دل میں تمہارے خیالات کے لیے کتنی عزت ہے۔ میں تمہاری ہر بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن جس تلخ تجربے سے اس وقت پاکستان گزر رہا ہے اس کی سنگینی کا تم نوجوان لوگوں کو

اندازہ نہیں۔ جن فوجی عدالتوں کا تم نے ذکر کیا ہے تمہیں اندازہ نہیں وہاں معمولی خلاف ورزیوں پر بغیر کسی وکیل یا دلیل کے پندرہ منٹ کی سماعت کی بعد لوگوں کو عمر قید کی سزا سنادی جاتی ہے۔

چوہدری محمد حسین صاحب جب پچھلے دنوں شہر آئے تھے تو مجھے کہہ گئے تھے کہ میں بوقت ضرورت تمہاری مدد کروں اور تمہارے احوال سے انہیں مطلع رکھوں

اگر میں نے انہیں بتایا کہ تم ایسا اخبار جاری کرنے جارہے ہو جس کے جاری کرنے میں ایسے خطرات لاحق ہیں تو سوچو وہ کیا سوچیں گے اور ان کا کیا حال ہو گا۔"

علی خواجہ صاحب کی باتیں سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے ان کی باتوں میں چھپی تلخ سچائی واضح طور پر دکھائی دینے لگی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور خواجہ صاحب سے پوچھا:" بطور طالب علم انہوں نے کالج میں پاکستان کے حوالے سے جو خواب دیکھے تھے ان کا کیا ہو گا؟ وہ ان خوابوں کو کیسے حقیقت کا روپ دے سکیں گے ؟ کیا یہ ظالمانہ نظام ہمیشہ پاکستان پر مسلط رہے گا؟"

علی کو پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ یک و تنہا دھوپ سے جھلستے میدان میں بغیر کسی سائبان کے کھڑا ہے اور اس کا جسم آہستہ آہستہ دھوپ کی شدت سے جھُلسنے لگا ہے۔

اس نے خواجہ صاحب کے دفتر میں ان کی کرسی کے پیچھے دیوار پر لگی قائداعظم کی تصویر کی طرف رحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ قائداعظم کے دلکش مہرباں سنجیدہ چہرے پر پھیلی ہلکی سی مسکراہٹ اسے کہہ رہی تھی ;" بیٹا ہم نے جیسے بھی حالات تھے اپنا کام کیا۔ اب یہ ملک تمہارا ہے۔ تم اس کے ساتھ کیا کرتے ہو۔ اسے جنت بناتے ہو یا جہنم یہ سب تمہارے اختیار میں ہے۔"

"لیکن بابا خواجہ صاحب تو کہتے ہیں یہاں اختیار کسی ایوب نام کے جنرل کا ہے جس کے وردی میں ملبوس کارندے ہر شہر میں بیٹھے لوگوں کو بغیر کسی وکیل یا دلیل کے عمر قیدیں سنا رہے ہیں۔" اس کا قائداعظم کی تصویر کے ساتھ ایک خیالی مکالمہ شروع ہو گیا۔

علی کو گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر خواجہ صاحب نے اسے کہا:

"دیکھو علی ابھی تمہارے پاس غور و فکر کے لیے مہینہ ڈیڑھ باقی ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ سوچ بچار کرنے کے بعد مجھے بتا دینا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔"

علی نے خواجہ صاحب سے پوچھا کہ "وہ کیا سمجھتے ہیں انہیں ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟"

"دیکھو اگر تم میری رائے پوچھتے ہو تو تمہیں اخبار کے کاروبار سے فی الحال دور رہنا چاہیئے۔ لیکن اگر تم اخبار کا اجرا کرنا چاہتے ہو تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ با قاعدہ وزارتِ اطلاعات سے اس کی اجازت لے کر جاری کرو۔ اگرچہ حالات سخت ناگوار اور ناموافق ہیں لیکن میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اور توقع ہے کہ میں اپنے اثر ورسوخ سے تمہارے لیے وزارت اطلاعات سے اجازت نامہ حاصل کر لوں گا۔

علی نے خواجہ صاحب کی یہ پروپوزل بھی پوری توجہ سے سنی۔ اور یہ کہہ کر ان سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مشورہ کرے گا اور پھر انہیں اطلاع دے گا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور ان کا مستقبل کے بارے میں کیا منصوبہ ہے۔

میئر سے ہاتھ ملا کر وہ ان کے دفتر سے رخصت ہوا تو اس کا دل بوجھل تھا۔

اگرچہ دوپہر ہوا چاہتی تھی اور اس نے صبح ناشتے میں چائے کے سوا کچھ کھایا پیا نہیں تھا لیکن بھوک اس سے اب بھی کوسوں دور تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ آج وہ گھر واپس نہ جائے اور یونہی شہر کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہے۔

پھر اسے صبح زرینہ سے ہونے والی ملاقات یاد آئی۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں جھلملاتے خواب یاد آئے تو وہ خود ہی مسکرا اٹھا اور اس کے قدم زیادہ اعتماد کے ساتھ گھر کی طرف اٹھنے لگے۔

فصل 15

سڑکوں پر آوارگی کے بعد جب وہ گھر پہنچا تو موسم سرما کا سورج پوری آب و تاب سے چمکنے کے باوجود ہوا میں پھیلی سردی کو اس کے حال پر چھوڑ کر تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے سارے دوست کہیں غائب تھے۔

وہ پچھلے پہر کی تیزی کے ساتھ دھندلاتی ہوئی دھوپ میں صحن میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر سستانا چاہتا تھا۔

گھر سے ہاسٹل اور ہاسٹل سے اس کرائے کے گھر میں منتقل ہونے کے بعد زندگی میں پہلی بار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ تنہا رہے۔ کوئی اسے تنگ نہ کرے۔ نہ کوئی سوال ہو نہ جواب۔ نہ کوئی پوچھے کہ کیا اسے کسی چیز کی ضرورت ہے؟

بس تنہائی ہو اور ایک خوبصورت خیال جو سمندر کی موجوں کی طرح اُبھرے اور پھر ٹوٹ کر حد نظر تک پھیلے نیلے پانیوں پر بکھرتا چلا جائے۔ یا خوشبو کا کوئی خوشگوار جھونکا جو آہستگی سے اس کی روح میں اترتا چلا جائے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں مُند گیں۔

اس نے دیکھا کہ وہ کسی اجنبی سرزمین پر پہاڑی کی چوٹی پر بنے شیشے کے ایک گھر میں بیٹھا ہے جس میں چاروں طرف سبز و شاداب پہاڑیوں کے سلسلے دور تک پھیلے دکھائی دے رہے تھے۔ دُور پہاڑیوں کی اوٹ میں سورج ڈوب رہا تھا جس کی سرخ و زرد کرنوں سے شیشے کا گھر سونے کے بنے کسی گنبد کی طرح چمک رہا تھا۔

پھر اس نے دیکھا دور نیلے پانیوں کی ایک پُرسکون جھیل ہے جس کی سطح پر ایک کشتی تیر رہی ہے اور وہ اس کشتی میں تنہا بیٹھا نیلے پانی کے پھیلاؤ سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

اس نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کی حالت میں وہ اسی طرح صحن میں بچھی کرسی پر اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک ہوا میں بڑھتی خنکی نے اسے اپنی شدت کا احساس نہیں دلایا۔

وہ ایک خوشگوار احساس کے ساتھ کرسی سے اٹھا اور شام کے کھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے دوستوں میں سے کسی کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔ یہ آج سارے کہاں رہ گئے ہیں۔ شام گئے ان کی اس طرح غیر موجودگی سے وہ ان کے بارے میں متفکر ہونے لگا۔

پھر اسے میئر کے دفتر میں ہونے والی گفتگو کی جُزئیات یاد آنے لگیں۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ بنگالی پریس کے مالک نے مارشل لا کے حکام کو اُن کے اخبار کے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور اس علاقے کے انچارج کرنل نے میئر سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے بات کر کے مجھے اس اخبار کے چکر سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔

کرنل صاحب علی کو اچھی طرح جانتے تھے اور اُنہیں اس کے خاندانی اثر و رسوخ کا بھی اندازہ تھا لیکن صفدر شاہ اور سلیم موٹا تو معمولی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

صفدر شاہ کا خاندان تو پھر بھی علاقے میں کچھ جانا پہچانا تھا اور ان کا علاقے میں کچھ اثر و رسوخ بھی تھا لیکن سلیم موٹے کا بہت معمولی خاندان سے تعلق تھا۔ کرنل کے خیال نے علی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دراصل کرنل کو آج میئر سے علی کی صبح نو بجے والی ملاقات کا علم تھا۔

کرنل جانتا تھا کہ علی کے میئر کے ساتھ کس طرح کے خاندانی تعلقات ہیں۔ اسے پتہ تھا کہ علی میئر سے ملنے جائے گا تو دوپہر سے پہلے واپس نہیں لوٹے گا۔

اس نے دس بجے کے قریب ایک میجر کو دو فوجیوں کے ساتھ علی کے گھر پر بھیجا۔ صفدر شاہ اور سلیم موٹا ابھی علی کے گھر پہنچے ہی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علی دس گیارہ بجے تک میئر سے مل کر واپس آجائے گا تو پھر مل کر لنچ کریں گے اور اخبار کے منصوبے پر مزید گفتگو کریں گے۔ اِسی خیال سے وہ چڑھتے سورج کی دھوپ تاپنے کے لیے صحن میں بچھی کرسیوں پر بیٹھے تھے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلیم موٹے نے

اٹھ کر دروازہ کھولا تو باہر ایک فوجی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ میں ایک میجر بیٹھا تھا اور دو فوجی بندوقیں تانے دروازے پر کھڑے تھے۔ فوجیوں نے بندوق کے اشارے سے سلیم موٹے کو جیپ پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

صفدر شاہ ابھی تک دھوپ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ فوجیوں نے صفدر شاہ کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ صفدر شاہ بغیر کچھ کہے فوجیوں کے ساتھ جیپ پر بیٹھ گیا۔ فوجی ان دونوں کو کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔

علی اس ساری صورت حال سے بے خبر تھا۔ اظہر تو گاؤں گیا ہوا تھا لیکن صفدر شاہ اور سلیم موٹا غائب تھے۔

کرنل کا خیال آتے ہی اس نے اِن لائنوں پر سوچنا شروع کر دیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مارشل لا والے اُنہیں اٹھا کر لے گئے ہوں۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ اظہر گاؤں سے واپس چلا آیا۔ اُس نے بھی آتے ہی صفدر شاہ اور سلیم موٹے کے بارے میں پوچھا۔ علی نے اُسے صبح میئر سے ہونے والی ملاقات کی تفصیلات بتائیں اور پھر صفدر شاہ اور سلیم موٹے کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ اظہر نے علی کے خدشات سنے تو اس کو بھی ان کے بارے میں تشویش ہوئی۔ اس نے علی سے کہا کہ اگر کرنل نے میئر کو ان کے اخبار نکالنے کے منصوبے کے بارے بتایا تھا تو اس بات کا امکان ہے کہ فوجی صفدر شاہ اور سلیم موٹے کو اُٹھا لے گئے ہوں۔

اظہر نے علی سے پُوچھا اُس نے صبح گھر کس وقت چھوڑا تھا اور پھر کس وقت گھر واپس لوٹا تھا۔ علی نے اسے بتایا کہ وہ صبح سات بجے گھر سے چلا گیا تھا اور پھر پچھلے پہر ساڑھے تین چار بجے کے قریب واپس لوٹا تھا۔

اظہر نے گھڑی پر نظریں دوڑایں تو شام کے سات بج رہے تھے۔ علی نے ابھی تک صبح والے کپڑے تبدیل نہیں کیئے تھے۔ اس نے علی سے کہا کہ انہیں فوراً میجر امجد کے گھر جا کر صفدر شاہ اور سلیم موٹے کی گمشدگی کی کھوج کرنی چاہیئے۔ اگر فوجی اُنہیں اُٹھا کر لے گئے ہیں تو آج کی رات بہت اہم ہے۔ اُنہیں گھر واپس آنا چاہیئے ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔

اظہر مارشل لا آفس میں متعین میجر امجد کو جانتا تھا۔ وہ اُس کے بھائی میجر امتیاز کا کورس میٹ تھا۔ اُس کی میجر امتیاز کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ اظہر کئی بار اپنے بھائی کے ساتھ میجر امجد کو مل چکا تھا۔ میجر امجد کئی بار ان کے گھر بھی آ چکا تھا۔

علی اور اظہر نے ٹیکسی کرائے پر لی اور کنٹونمنٹ کے علاقے کے طرف روانہ ہو گئے۔ آدھا گھنٹہ کینٹ کی سڑکوں پر دوڑنے کے بعد گاڑی ایک بیرک نما گھر کے باہر رُکی۔

اظہر نے گھر کے دروازے پر لگی بیل دبائی تو شلوار قمیض میں ملبوس میجر امجد نے گھر کا دروازہ کھولا۔ اُس نے علی اور اظہر کو اپنے دروازے پر دیکھا تو اُنہیں دروازے سے اندر آنے کے لیے کہا۔ میجر امجد نے اظہر کو گلے لگایا اور علی کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اظہر نے میجر امجد کو وہاں آنے کا مقصد بتایا تو میجر صاحب متفکر ہوتے ہوئے بولے: "تو کیا تم دونوں کو جانتے ہو۔؟"

"ہاں وہ میرے دوست ہیں۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد ہم زیادہ تر ٹائم علی کے گھر پر اکٹھے گزارتے ہیں۔ وہیں اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے ہیں۔"

"ان دونوں کی قسمت اچھی ہے کہ وہ تمہارے دوست ہیں۔ اور یہ بھی تم نے اچھا کیا کہ تم آج ہی میرے گھر چلے آئے۔ ورنہ کل تک ان کے بارے میں نہ تم جانتے نہ ہم۔"

"لیکن میجر صاحب انہوں نے کیا کیا ہے۔؟"

"وہ حکومت کے خلاف اخبار نکالنے جا رہے تھے۔ بنگالی پریس کے مالک نے ہمیں سب بتا دیا تھا۔"

اظہر نے کہا اخبار نکالنے کی بات ضرور ہوئی تھی لیکن حکومت کے خلاف اخبار نکالنے کی بات کسی نے نہیں کی۔

"اچھا اظہر بولو کیا کھاؤ پیو گے۔ اگر میں نے تمہیں کھانے پینے کے بارے میں نہیں پُوچھا تو تمہارا بھائی میجر امتیاز مجھ پر فرینڈلی فائر بھی کر سکتا ہے۔" میجر امجد نے اپنائیت کے ساتھ اظہر اور علی سے پوچھا۔

"ہم کھائیں پئیں گے ضرور لیکن صفدر شاہ اور سلیم موٹے کے ساتھ۔" اظہر نے بھی بھائیوں ایسی اپنائیت کے ساتھ جواب دیا۔

میجر امجد نے فون پر کسی سے کہا کہ وہ آج دوپہر اٹھائے گئے دونوں نوجوانوں کو اس کے گھر پہنچادے۔

تھوڑی دیر بعد صفدر شاہ اور سلیم موٹا ایک فوجی کے ہمراہ میجر امجد کے گھر پر موجود تھے۔ علی اور اظہر نے صفدر شاہ اور سلیم موٹے کو گلے لگایا۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا۔

کھانے کے دوران میجر امجد نے اظہر، علی، صفدر شاہ اور سلیم موٹے کو اخبار کے چکر سے دور رہنے کی ہدایت کی۔

پھر میجر امجد نے ایک فوجی سے کہا کہ وہ انہیں جیپ پر ان کے گھر چھوڑ آئے۔

آدھے گھنٹے بعد سارے دوست علی کے گھر پر بیٹھے اس سے صبح کی چائے پر ہونے والے خوبصورت اور خوشگوار حادثے کی تفصیلات سن رہے تھے۔ اور طرح طرح کے سوالوں سے اسے تنگ کر رہے تھے۔ وہ بھی مزے لے لے کر ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

فصل 16

اگلے دن صبح کے نو بج چکے تھے۔ سورج کی کرنیں دُھند کی دبیز چادر کاٹتے ہوئے سردی سے ٹھٹھرے درو دیوار کو روشن کر رہی تھیں۔ علی ابھی تک سو رہا تھا۔ کل رات کے واقعات اور دیر سے سونے کی وجہ سے ابھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔

اسے نیند میں محسوس ہوا کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ وہ جلدی سے گھبرا کر اٹھا اور جا کر دروازہ کھولا۔

دروازے پر چہرے پر بڑی سی مسکراہٹ سجائے زرینہ کھڑی تھی۔ زرینہ کو دیکھ کر علی بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

کل زرینہ سے ملنے کے بعد علی کو اندازہ تھا کے وہ اسے دل دے چکی ہے لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس کے خواب اس طرح اس کے دروازے پر آ کر دستک دیں گے۔

زرینہ نے علی کے چہرے پر ابھرتے ڈوبتے رنگوں کو دیکھا تو بولی: "کیا مجھے یوں ہی باہر ٹھنڈ میں کھڑا رکھو گے یا اندر آنے کے لیے بھی کہو گے؟"

علی نے معذرت چاہتے ہوئے فوراً اُسے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو اس نے گھر کے اندرونی منظر پر اُچٹتی سی نظر دوڑائی۔

یہ چھوٹا سا گھر اسے اچھا لگا۔ ایک خواب گاہ۔ ایک جدید آلات سے مزّین کچن۔ ایک ماڈرن باتھ روم۔ چھوٹا سا صحن اور ڈرائنگ روم جس میں دس بارہ بندوں کے بیٹھنے کے لیے سادہ لیکن خوبصورت کرسیاں رکھی تھیں۔

علی کی ضروریات کے لیے یہ گھر کافی تھا۔

"میں اس علاقے سے گزر رہی تھی سوچا تمہیں ملتی جاؤں۔" اس نے علی کے چہرے پر ابھی تک پھیلے خوشی اور حیرانگی کے تاثرات دیکھ کر کہا۔

"اِدھر سے گزر رہی تھی یا مجھے ملنے کے لیے اِدھر آئی تھی۔" علی نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں تمہیں ملنے کے لیے اِدھر آئی تھی۔ کل تم سے ملنے کے بعد میں نے چاہا تمہیں مزید جانوں۔ اور یہ تم سے ملے بغیر ہو نہیں سکتا۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ کل رات بھی یہاں آئی تھی لیکن کوئی گھر پر نہیں تھا۔ لیکن اس نے یہ کہا نہیں۔

علی نے کہا کل اسے خدا حافظ کہنے کے بعد اس کی بھی سارا دن یہی حالت رہی۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اسے ملے۔ اس کے ساتھ مزید وقت گزارے اور اس کو اچھی طرح جانے۔ اسے اپنے بارے میں بتائے اور اُس سے اُس کے بارے میں سنے۔

زرینہ نے کل علی کو جس لباس میں دیکھا تھا وہ اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن آج اُس نے اُسے لباسِ خوابیدگی میں دیکھا تو وہ اُسے اور بھی اچھا لگا۔ اس کی آنکھوں میں ٹُوٹتی ہوئی نیند کے سائے اور بے ترتیب بال اِس طرح اُس کے دل میں اُتر گئے کہ اُس کا دل چاہا وہ اِسی طرح سارا دن اُس کے ساتھ گزارے۔

علی نے زرینہ کو محبت بھری نظروں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھا تو کہا وہ چاہتا ہے کہ وہ جلدی سے نہا دھو کر تیار ہو اور پھر وہ کہیں کسی کیفے میں جا کر چائے پیئیں اور ہلکا پھلکا ناشتہ کریں۔

"نہیں ہم کہیں نہیں جائیں گے۔" زرینہ نے لجاجت سے کہا۔ "ہم یہیں بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔ اور ہاں تمہیں نہانے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے ایسے میں اور زیادہ اچھے لگتے ہو۔"

علی نے گہری نظروں سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی روشن آنکھوں میں ایک عجیب طاقت اور چمک تھی۔ اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔

اُسے لگا وہ اُن آنکھوں کے سحر کے سامنے بے بس ہے اور اُسے وہی کرنا ہو گا جو زرینہ اُسے کہہ رہی تھی۔

اس نے کہا: " ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تم برا نہ مانو تو ہم کہیں جا کر چائے پیئیں گے اور پھر واپس آ جائیں گے۔"

زرینہ نے سر کے اشارے سے علی کی بات سے اتفاق کیا۔ علی نے جلدی سے دانت صاف کئے۔ سر کے بالوں کو پانی لگا کر انہیں قدرے درست کیا اور شلوار قمیض پر اُوور کوٹ پہن کر زرینہ کے ساتھ گھر سے نکل پڑا۔

باہر دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ سڑک پر کافی ٹریفک تھی۔ گاڑیاں، رکشے، موٹر سائیکلیں، سائیکلیں اور تانگے آ جا رہے تھے۔ وہ دونوں فٹ پاتھ پر باتیں کرتے ہوئے ایک ساتھ چل رہے تھے۔ وہ جس کیفے میں جانا چاہتے تھے وہ کچھ فاصلے پر تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے سحر میں گرفتار تھے۔ کوئی ان کو اکٹھے چلتے دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ان کی دوسری ملاقات تھی۔

علی نے زرینہ سے کہا اسے اس کا نام بہت اچھا لگتا ہے۔ کتنا پیارا نام ہے۔ وہ کل سے اس نام کے سحر میں کھویا ہے۔

"اور کیا میں اچھی نہیں لگتی؟" زرینہ نے علی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے نام سے زیادہ اچھی لگتی ہو۔ تمہارے نام میں حسن تمہاری وجہ سے ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ناموں کا حسن ان سے موسوم شخصیات کی وجہ سے ہوتا ہے۔"

"زرینہ میرا سرکاری نام ہے جو میری پیدائش کے وقت سرکاری دفتر میں درج ہوا تھا۔ میرے سکول اور کالج کی دستاویزات میں بھی یہی نام درج ہے لیکن میرے گھر والے مجھے زری کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"زری بھی خوبصورت نام ہے۔ کیا میں بھی تمہیں زری کہہ کر بلا سکتا ہوں۔" علی نے بھی جواباً شرارت آمیز لہجے میں زرینہ سے پوچھا۔

"علی تم مجھے جو نام دو گے میں وہی نام اپنالوں گی۔ میں وہی بن جاؤں گی جو تم مجھے بنانا چاہو گے۔" زرینہ نے محبت سے جواب دیا۔

کل کی ملاقات سے علی پہلے ہی زرینہ کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اب اس کی باتیں اسے اور بھی مسحور کر رہی تھیں۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ صبح گھر سے نکلے گا اور اس کی زندگی اس طرح اچانک اتنی خوشیوں سے بھر جائے گی کہ انہیں سمیٹنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

"اور میرے نام کے بارے میں محترمہ کا کیا خیال ہے؟" علی نے استفہامیہ انداز میں زرینہ سے پوچھا۔ اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "میرا سرکاری نام علی حسین ہے لیکن میں ہمیشہ خود کو علی کہتا ہوں۔ میرے گھر والے اور یار دوست سب مجھے علی کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"علی مجھے تم اور تمہارا نام دونوں اچھے لگتے ہیں۔ میں بھی تمہارے دوستوں کی طرح ہمیشہ تمہیں علی کہہ کر پکاروں گی۔"

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کا مطلوبہ کیفے آ گیا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے کیفے کے اندر چلے گئے۔

سورج تقریباً آدھے دن کی منزل طے کر چکا تھا۔ کیفے کے اندر سڑک کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی کے پاس رکھی ایک ٹیبل پر وہ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ علی نے گھڑی دیکھی تو دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

اس نے زرینہ کی طرف مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے اُسے پوچھا کہ وہ کیا لے گی۔

"علی ایک آئیڈیا ہے۔ دوپہر ہوا چاہتی ہے۔ میں نے تمہیں سوتے سے اُٹھایا تھا۔ جانتی ہوں تم نے ناشتہ نہیں کیا۔ میں نے بھی صبح ناشتہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے فی الحال یہاں چائے پیتے ہیں اور پھر جناح گارڈن میں واقع ریستوران میں جا کر لنچ کریں گے اور پھر گھر واپس جائیں گے۔ چائے پی کر تھوڑا اور چلیں گے تو بھوک اور چمک اٹھے گی۔" اس نے اپنائیت سے علی سے کہا۔

"یہ بہت اچھا خیال ہے۔ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" علی نے زری سے سوال کیا۔

"اگر کل چائے کے ٹیبل پر میں تمہارا دماغ پڑھ سکتی تھی تو آج اس سے بہتر پڑھ سکتی ہوں۔ کیوں کہ آج میں تمہیں کل سے زیادہ جانتی ہوں۔" زرینہ نے علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں اس طرح کھوئے تھے کہ اُنہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ویٹر کب سے ان کے پاس کھڑا ان کے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا۔

دونوں نے ایک ساتھ ویٹر کی طرف دیکھا اور پھر ایک ساتھ کہا: " دو کپ چائے۔"

"اور کچھ؟" ویٹر نے سوال کیا۔ " نہیں اور کچھ نہیں۔" دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں ویٹر ایک چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور دو خالی کپ لے آیا۔ علی نے چائے کپوں میں ڈالی اور پھر دونوں چُسکیوں سے چائے پینے لگے۔

چائے پی کر دونوں کیفے سے باہر نکلے تو ریڈیو پر دوپہر کی خبریں چل رہی تھیں۔ حکومت نے ملک میں تمام اخبارات کی اشاعت پر پابندی لگا دی تھی۔ تمام اخبارات کے مالکان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اخبارات کی اشاعت کے لیے وزارت اطلاعات سے ڈیکلریشن حاصل کریں۔ جو اخبار مالک وزارت اطلاعات سے ڈیکلریشن حاصل نہیں کرے گا وہ اخبار شائع نہیں کر سکے گا۔

اور اگر کوئی نیا اخبار یا میگزین جاری کرنا چاہے تو اُسے بھی وزارت اطلاعات سے ڈیکلریشن لینا ہو گا۔ کسی اخبار یا میگزین کو استثنا حاصل نہیں ہو گا۔ یہاں تک کہ مذہبی اور ادبی رسائل کے لیے بھی ڈیکلریشن لینا ضروری قرار دیا گیا۔ اور جو کوئی بغیر ڈیکلریشن اخبار یا رسالہ چھاپے گا اسے پانچ سال قید بامشقت دی جائے گی اور دس ہزار روپے جرمانہ کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ پریس مالکان کو بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اخباری پیپر حاصل کرنے کے لیے بھی حکومت سے پرمٹ حاصل کریں۔ ہر ایک پریس کے لیے پیپر کا کوٹہ مقرر کیا جائے گا۔ اگر کسی پریس سے کوٹے سے زیادہ پیپر برآمد ہوا تو اسے بھی پانچ سال قید بامشقت دی جائے گی اور دس ہزار روپے جرمانہ کیا جائے گا۔

علی اور زرینہ نے چلتے چلتے کیفے کے ریڈیو پر یہ خبر سنی۔ زرینہ کو اندازہ نہیں تھا کہ علی اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا اور اس ضمن میں خاصی پیش رفت بھی کر چکا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اخبار جاری کرنے کے منصوبے کے نتیجے میں علی کو میئر نے کس طرح کی وارننگ دی تھی اور کس طرح فوجیوں نے اس کے دوستوں کو گھر سے اٹھا کر پورا دن ایک ملٹری بیرک میں بنائی گئی عارضی حوالات میں بند رکھا تھا۔

علی ریڈیو پر اخبارات کے ڈکلیریشن کی خبر سن کر چپ رہا لیکن زرینہ نے کہا: "یہ فوجی ملک کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ یہ ملک کو کس سمت میں لے جانا چاہتے ہیں؟

میں نے چند سال قبل بی اے کرنے کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ لیا تھا تو میرے ماموں کتنے خوش تھے۔ میرے والد نہیں چاہتے تھے کہ میں لاَ کروں۔

اس ملک میں خواتین کے قانون پڑھنے کی ابھی کوئی روایت نہیں۔ لیکن ماموں کے اصرار پر میرے والد نے اجازت دے دی تھی۔ اور جب میں نے لیبر لاَ میں ڈگری لینے کے بعد اپنی فیلڈ میں کام شروع کیا تھا تو ماموں خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔

لیکن مارشل لا والے اپنی وردی اور بندوق کے زور پر کس طرح آئین، قانون اور ہماری پڑھائی پر خطِ تنسیخ پھیر دیتے ہیں۔"

وہ چلتے چلتے اپنے بارے میں کتنی باتیں کہہ گئی تھی۔ اس کے خیالات اور باتیں سن کر علی کے دل میں اس کی محبت اور زیادہ بڑھ گئی۔

زرینہ ہی وہ خاتون تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ دیکھنے میں گلاب کا پھول، محبت میں فالودے کی قلفی اور زندگی میں ہیرے کی انی۔ دیکھے تو گلاب کے پھول کی طرح، محبت کرے تو فالودے کی قلفی کی طرح پگھلتی جائے، اور کاٹنا چاہے تو ہیرے کی انی کی طرح شیشہ بھی کاٹ ڈالے۔

"زری فی الحال تو ہم لنچ کے لیے جناح گارڈن جا رہے ہیں۔ اور ویسے بھی اب بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔" علی نے زرینہ کی باتیں سن کر جواب دیا۔

"ہاں علی تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے بھی کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں تمہارے گھر آئی تھی کہ مل کر ڈنر کریں گے لیکن تم گھر پر نہیں تھے۔"

"اچھا تو محترمہ کل رات بھی تشریف لائی تھیں؟" پھر علی نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا:

"اللہ میاں تم سے شکایت کروں یا تمہارا شکریہ ادا کروں۔ زرینہ رات میرے گھر آئی اور میں گھر پر نہیں تھا۔"

ایسی باتیں کرتے پیدل چلتے وہ جناح گارڈن جا پہنچے -ریستوران کا اندرونی ماحول بہت خوشگوار تھا۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی قائد اعظم محمد علی جناح کی ایک قد آدم تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔

باقی دیواروں پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے تاریخی اور اہم مقامات کی تصویریں انتہائی دلکش فریموں میں نصب تھیں۔

دونوں نے ویٹر کی راہنمائی میں ایک ٹیبل سنبھالی۔ مینیو دیکھ کر خوراک آرڈر کی اور دوبارہ اپنی باتوں میں کھو گئے۔

فصل 17

جناح گارڈن سے علی اور زرینہ کھانا کھا کر نکلے تو ان کی دنیا بدل چکی تھی۔ وہ دو ایسے پرندے تھے جو آسمان پر ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔ کھلا آسمان ان کی دنیا تھی۔ ساری دنیا ان کے پروں کے نیچے تھی۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح ساتھ ساتھ اُڑتے رہیں گے۔

"محبت سے بڑی کوئی طاقت نہیں۔" علی زرینہ سے کہہ رہا تھا۔" اے میری مہربان دوست۔ تم نے میرے دل کی مہمان بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم سے اچھا کوئی مہمان نہیں جو میرے دل میں قیام کرے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

وہ کہہ رہی تھی: "نہیں علی تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھ سے نام پوچھا نہ نسب اور مجھ پر اپنے دل کے دروازے کھول دیئے۔ میں تمہیں اچھی لگی اور تم نے مجھے اپنالیا۔"

"میں تم سے اس نیلے آسمان کی وسعتوں میں تمہارے ساتھ اڑتے ہوئے یہ عہد کرتی ہوں کہ اب اسی طرح تمہارے ساتھ اڑتی رہوں گی۔ تم جس درخت پر بیٹھو گے اس درخت پر بیٹھوں گی۔ جس پہاڑ پر بسیرا بناؤ گے وہاں تمہارے ساتھ قیام کروں گی۔ جہاں تک اڑنا چاہو گے تمہارے ساتھ اڑوں گی۔"

"اور۔۔۔۔۔۔؟" علی نے شرارتی انداز میں سوال کیا

"اور تمہارے بچوں کی ماں بھی بنوں گی۔" زرینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

انہی خیالوں میں چلتے وہ علی کے گھر واپس پہنچے تو سورج آسمان پر دو تہائی منزلیں طے کر چکا تھا۔ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر وہاں موجود تھے۔

انہوں نے غیر متوقع طور پر علی اور زرینہ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو خوشی سے ناچنا شروع ہو گئے۔

رسمی تعارف تک کی ضرورت محسوس نہ کی۔ علی زرینہ کو ان کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا اور انہیں زرینہ کے بارے میں۔ اکٹھے سب ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے تھے کہ ملاقات سے پہلے ہی ان میں ایک انڈراسٹینڈنگ موجود تھی۔

وہ سب محسوس کر رہے تھے کہ وہ ایک گھر کے فرد تھے۔ ایک مکمل گھر کے۔ جس کی بنیادیں رکھی جاچکی تھیں اور اب ایک گھر کی طرح اس کے پھلنے پھولنے کا عمل شروع ہونے جارہا تھا۔ علی اور زرینہ بھی ان کے ساتھ رقص میں شامل ہو گئے۔

رقص کرتے ہوئے سب کی سانسیں پھولنے لگیں تو وہ صحن میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سلیم موٹے نے چائے بنانے کی پیشکش کی تو سب نے ہُرے کا نعرہ لگایا۔

سب کی سانسیں کچھ نارمل ہوئیں تو صفدر شاہ نے زرینہ کو باقاعدہ خوش آمدید کہا۔

"بھابی علی کی زندگی میں شامل ہو کر صرف آپ نے علی پر نہیں ہم سب پر احسان کیا ہے۔" زرینہ نے صفدر شاہ کے اُسے بھابی پکارنے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ حالانکہ ابھی اس کی علی کے ساتھ شادی نہیں ہوئی تھی۔

صفدر شاہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوے کہا: " اب تک ہماری زندگیاں بے نظم تھیں۔ آپ کی علی کے ساتھ وابستگی سے ہماری زندگیوں میں نظم آئے گا۔ ہم اپنے اور اپنے ملک کے بارے میں روز وشب جو خواب دیکھتے ہیں اب ان کی تکمیل ہم بہتر انداز میں زیادہ یقین اور اعتماد کے ساتھ کر سکیں گے۔"

"میں نے بھی چند سال قبل دیہاتی علاقے سے ہوتے ہوئے اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود لاَ میں داخلہ لیا تھا تو میرے پیش نظر یہی بات تھی کہ کس طرح اس ملک کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ میرے سامنے دو ماڈل تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا اور حسین شہید سہروردی کا۔ دونوں کا لاَ سے تعلق تھا۔ میں نے سوچا اگر میں لاَ کر لوں تو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس ملک میں بہتری لانے میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہوں۔" زرینہ نے صفدر شاہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

علی، صفدر شاہ، اظہر اور سلیم موٹے نے زرینہ کی باتیں سنیں تو اُنہیں اُن میں اپنی باتوں کی بازگشت سنائی دی۔

"جب علی سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنی باتوں میں قائداعظم اور حسین شہید سہروردی کا ذکر کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی سوچیں میری سوچوں کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کی لائف پارٹنر بنوں گی۔"

"لیکن بھابی آپ کے ماں باپ آپ کے انتخاب کے ساتھ کیا اتفاق کریں گے۔" اظہر نے سوال کیا

" آج تک انہوں نے کبھی میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ میری ہر بات مانتے ہیں۔ اور اگر کبھی اُنہیں کسی بات پر تھوڑا بہت تردّد ہو تو ماموں جان زندہ باد۔ وہ ہمیشہ ان کے تردّد کو دور کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے اپنے دل میں علی کو اپنا لیا ہے اور اس نے مجھے۔ اب ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔" یہ کہہ کر زرینہ نے کہا کہ آج وہ سب اس کے ماموں کے گھر ڈنر کریں گے۔ میں نے انہیں کل علی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے کل ہی کہہ دیا تھا میں علی کو ساتھ لے کر گھر آؤں۔ وہ علی سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ چنانچہ آپ سب تیاری کریں ہمیں اب ماموں کے گھر جانا ہے۔

زرینہ کی خواہش کا سن کر علی نے کہا کہ میں پہلے شیو بناؤں گا، شاور لوں گا، کپڑے بدلوں گا اور پھر گھر سے باہر قدم رکھوں گا۔ زرینہ نے علی سے اتفاق کرتے ہوئے کہا:

"ہاں اب میں بھی چاہتی ہوں کہ تم پوری تیاری کے ساتھ ماموں کے سامنے جاؤ۔ آخر وہ بھی وکیل ہیں۔ اور کسی وکیل کے سامنے بغیر تیاری کے جانا بعض اوقات سائل کے لیے مسائل بھی کھڑے کر سکتا ہے۔"

زرینہ کی بات سن کر علی اور اس کے دوست ڈنر پر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اور وہ چند لمحوں کے لیے خواب گاہ میں جا کر آنکھیں بند کر کے علی کے بستر پر لیٹ گئی۔

آنکھیں بند کرتے ہی زرینہ علی کی انگلی تھام کر ان جانی وادیوں اور پہاڑوں کی طرف چل دی۔ یہ زمیں، یہ آسماں، یہ وادیاں، یہ پہاڑ، یہ جھیلیں، یہ سمندر، یہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اگے چیڑ کے درخت اور ان کے بیچوں بیچ بہتی پر شور ندی اور ندی کے پانی کے اچھلتے ہوئے سورج کی دھوپ میں چمکتے قطرے، یہ سب کتنا خوبصورت ہے۔ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ زرینہ کی بند آنکھوں کے باوجود اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

علی ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے تکیے پر سر رکھ کر بند آنکھوں کے ساتھ لیٹی زرینہ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھی تو مبہوت کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اس کا جی چاہ وہ یونہی لیٹی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔ دید کے اس تماشے کی لذت سے وہ زندگی میں پہلی بار روشناس ہوا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ یہ لذتِ شوق ختم ہو۔

وہ اس وقت تک زرینہ کو وہاں لیٹے دیکھتا رہا جب تک اس نے خود آنکھیں نہیں کھولیں۔

تب تک سب تیار ہو چکے تھے۔ اظہر پہلے ہی جا کر ٹیکسی لا چکا تھا۔ وہ زرینہ کے ماموں کے گھر جانے کے لیے ٹھس کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ زرینہ نے ٹیکسی والے سے کہا وہ اُنہیں فیض روڈ لے چلے۔

فصل 18

ٹیکسی فیض روڈ پر مڑ کر ایک بہت بڑے ولا کے سامنے آ کر رکی تو زرینہ نے کہا: "ہماری منزل آگئی ہے۔ یہی ہے میرے ماموں کا گھر۔" "یہ تو چوہدری فیض ایڈوکیٹ کا گھر ہے۔" علی نے کہا

"جی ہاں یہ اُنہی کا گھر ہے اور وہ میرے ماموں ہیں۔ میں یہیں ان کے ساتھ رہتی ہوں۔"

علی چوہدری فیض ایڈوکیٹ کے ساتھ کئی بار میئر شہر خواجہ احسن کی رہائش گاہ پر مل چکا تھا۔ چوہدری فیض شہر کے نامی گرامی وکیل تھے۔ پاکستان کے چُوٹی کے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علی کے والد چوہدری محمد حسین کے ساتھ بھی ان کی جان پہچان تھی۔ ان کی جب بھی علی کے ساتھ ملاقات ہوئی انہوں نے ہمیشہ اسے بیٹے کی نظر سے دیکھا۔

چوہدری فیض بھی ان وکیلوں میں شامل تھے جن سے ایوب خان نے برسر اقتدار آنے کے بعد قانونی مدد کی درخواست کی تھی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

جس کے نتیجے میں مارشل لاَ حکام چوہدری فیض سے بھی ناراض تھے لیکن چونکہ وہ پیشہ ور وکیل تھے اور سیاسی معاملات سے خود کو دور رکھتے تھے اس لیے ان پر کوئی عتاب نازل نہیں ہوا تھا۔

ایوب خان نے پہلے حسین شہید سہر وردی سے درخواست کی تھی کہ وہ ایک ایسا لیگل آرڈر بنانے میں ان کی مدد کریں جس سے وہ قانونی طریقے سے پاکستان پر حکومت کر سکیں۔ لیکن حسین شہید سہر وردی نے واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ کسی ایسی چیز کا حصہ نہیں بننا چاہتے جو ایوب خان کی فوجی حکومت کو قانونی جواز فراہم کرے۔ حسین شہید سہر وردی کے انکار پر انہیں ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور بعد میں وہ ملک بدر ہوئے۔

یہی درخواست چوہدری فیض سے بھی کی گئی تھی لیکن ان کے انکار پر ان کے خلاف کوئی ایکشن نہ ہوا۔ مارشل حکام خاصے سیخ پا تھے لیکن فوج میں کئی جرنیلوں کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے ساری بات رفت گزشت ہو گئی۔

اُنہوں نے گھر کے اندرونی حصے تک آتی روش پر علی کو زرینہ کے ساتھ چلتے دیکھا تو اطمینان کی سانس لی۔ اُنہیں زرینہ کے سمجھدار ہونے پر پورا اعتماد تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کسی ایسے نوجوان کا انتخاب نہیں کرے گی جو اس کے شایان شان نہ ہو۔ لیکن کل سے وہ قدرے بے کل تھے کہ اگر زرینہ نے کسی غلط نوجوان کا انتخاب کر لیا تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ پہلے ہی زرینہ کے والد ان سے خوش نہیں تھے کے انہوں نے اسے وکیل بنا ڈالا تھا۔ وہ اتنے بڑے زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی اسے وکالت پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن ان کا استدلال تھا کہ پڑھائی کرنے میں کیا ہرج تھا۔ پڑھے لکھے افراد اپنے مفادات کا تحفظ بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔ پڑھائی لکھائی سے ان میں سوجھ بوجھ پیدا ہوتی ہے جس سے وہ زندگی کے معاملات سے ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ بہتر انداز میں عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں۔

علی اور زرینہ کو ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر اُنہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ علی ہی وہ نوجوان تھا جس سے زرینہ شادی کرنے جا رہی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ یہ باقی نوجوان کون تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی وہ نہیں جانتے تھے۔

علی اور زرینہ جب گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے تو چوہدری فیض اور ان کی بیگم نے علی اور اس کے دوستوں کو خوش آمدید کہا۔ وہ سب بڑے سے ہال وے سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان نوکر نے ان کے سامنے خشک پھلوں اور میووں کی بڑی سی قاب لا کر رکھی اور پھر ان سے پوچھا کہ وہ کیا پینا پسند کریں گے۔ علی سمیت سب نے

چائے پینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر میں وہی نوکر ایک سنہری چائے دانی میں چائے لے آیا۔ چائے کے کپوں اور پلیٹوں کے کناروں پر چائے دانی سے ملتے سنہری رنگ کے حلقے بنے تھے۔

چوہدری فیض نے بغیر کسی تمہید کے علی کو فیملی میں خوش آمدید کہا۔ انہوں نے کہا وہ جانتے تھے کہ زرینہ بہت اسمارٹ ہے لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بھانجی اتنی اسمارٹ ہے کہ وہ علی جیسے دلپسند نوجوان کے ساتھ اتنی تیزی سے ناطہ جوڑ سکتی ہے۔

ماموں کی بات سن کر زرینہ کے چہرے پر شرماہٹ کے رنگ پھیل گئے۔ علی نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہے کہ اس کی زرینہ سے ملاقات ہوئی اور اس نے اس کا اپنے شریک حیات کے طور پر انتخاب کیا۔

چوہدری فیض صاحب نے علی سے پوچھا کہ اس نے کالج سے بی اے تو کر لیا تھا لیکن آگے کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کیا پڑھائی لکھائی جاری رکھنا چاہتا ہے یا کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے۔

علی نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا کہ اسے پیسے کے لیے تگ ودو کی ضرورت نہیں اس نے کبھی معاشی حوالے سے اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی نہیں کی لیکن پاکستان کی دگرگوں صورت حال پر وہ بہت پریشان رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طور پر اپنے وطن کی مدد کرے۔ اس نے مزید کہا جنرل ایوب کے مارشل لا کے بعد اسے چیزیں اور زیادہ خراب ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

اگر ملک میں آئین قانون کی عملداری قائم نہ ہوئی تو پھر پاکستان کا ایک مستحکم ملک کے طور پر اُبھرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور اگر ملک میں استحکام نہ ہوا تو معاشی ترقی کے سارے خواب بھی چکنا چور ہو جائیں گے۔

چوہدری فیض صاحب نے پوری سنجیدگی سے علی کی بات سنی اور پھر متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ وہ اس صورت حال میں اپنا کیا کردار دیکھتا ہے۔

علی نے کہا ہم نے کالج سے فارغ ہوتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم اخبار نکالیں گے اور اخبار کے ذریعے لوگوں کی تربیت کریں گے۔ انہیں بتائیں گے کہ آئین اور قانون کی کیا اہمیت ہے۔ ملک کے استحکام کے لیے اس کی کتنی ضرورت ہے۔ ترقی کرنے کے لیے ایک مستحکم اور فعال سیاسی نظام کیا اہمیت رکھتا ہے؟

"علی جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ انتہائی اہم باتیں ہیں۔ قانون کے پیشے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے میں جانتا ہوں کہ ان چیزوں کی کتنی اہمیت ہے۔

مجھے تعجب ہے کہ اتنی کم عُمر میں تم نے اتنا سیاسی شعور کیسے حاصل کیا ہے؟" علی نے چوہدری فیض کی باتیں سن کر کہا۔ "اس شعور میں اس کے گھر کے ماحول کا زیادہ حصہ ہے۔ گھر پر آنے والے سیاسی لیڈروں کے آس پاس پھرتے وہ ان سے ایسی سب باتیں سنتا تھا۔ تب تو یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن پھر اخبار پڑھنا شروع کیا اور اخبار میں اسمبلی میں کی گئی حسین شہید سہروردی کی آئین اور قانون کے حوالے سے تقریروں کے متن پڑھے تو پتہ چلا کہ آئین ہی وہ طاقت ہے جو معاشرے کی مختلف قوتوں میں توازن قائم رکھتا ہے۔ طاقت ور لوگوں کو طاقت کے بے تحاشا اور غلط استعمال سے روکتا ہے اور کمزور لوگوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

جب سے ایوب خان نے ملک میں مارشل لا لگایا ہے میں اکثر سوچتا ہوں کہ اب طاقت ور لوگوں کو طاقت کے غلط استعمال سے کون روکے گا اور معاشرے کے کمزور اور ان پڑھ لوگوں کے مفادات کا تحفظ کون کرے گا؟"

علی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "یہ میرے دوست ہیں صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر۔ انہوں نے عہد کیا ہے کہ یہ میرے ساتھ مل کر طاقت ور لوگوں کی اندھی طاقت کو آئین اور قانون کے ضابطوں میں بند کریں گے۔ اور کمزوروں کو اتنی طاقت فراہم کریں گے کہ کوئی ان کا استحصال نہ کر سکے۔"

علی یہ باتیں کر رہا تھا تو چوہدری فیض اور ان کی بیگم کے علاوہ زرینہ بھی اس کی باتیں پورے غور کے ساتھ سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے تفاخر کے رنگ واضح طور پر کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے انتخاب پر بہت مسرور ہے۔

ابھی وہ سب یہ باتیں کر رہے تھے کے زرینہ کے ممیرے بھائی سپورٹس پینٹس پہنے ہاتھ میں ٹینس پکڑے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ علی نے کھڑے ہو کر ان سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے خود کو مہمانوں سے متعارف کرایا۔

"میں عمران ہوں۔" پہلے بڑھے بھائی نے ٹینس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"میں جبران ہوں۔" پھر چھوٹے بھائی نے اپنا تعارف کرایا۔

ایسے میں علی کے دوستوں نے بھی کھڑے ہو کر یکے بعد دیگرے عمران اور جبران کے ساتھ ہاتھ ملائے اور انہیں اپنے نام بتائے۔

ابھی وہ ایک دوسرے سے اپنا تعارف کروا رہے تھے کہ ایک خوش لباس باورچی نے آ کر ٹیبل پر کھانا چننے کی اطلاع دی۔ وہ سب ڈرائنگ روم سے اٹھ کر ملحقہ ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ ڈائننگ روم کا ماحول بہت سحر انگیز تھا۔ دیواروں پر آویزاں سینریوں اور چھت پر لگی لائٹوں کے اہتمام سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ رات کے وقت کھلے آسمان کے نیچے کسی انتہائی روح افزا مقام پر بیٹھے ڈنر کر رہے ہیں۔

ڈنر کے دوران چوہدری فیض ان کی بیگم اور ان کے بیٹوں عمران اور جبران نے پُر لطف باتوں سے علی اور اس کے دوستوں کو احساس نہ ہونے دیا کہ وہ پہلی بار اس گھر میں بیٹھے ڈنر کر رہے تھے۔ اُنہیں محسوس ہوا وہ اس خاندان کا حصہ ہیں اور ہمیشہ کے لیے اس خاندان کے افراد خانہ کے ساتھ جڑے ہیں۔ ڈنر ختم ہوا تو سب اٹھ کر گھر کے گارڈن کے ساتھ ملحقہ لائبریری میں آ کر بیٹھ گئے۔

چوہدری فیض نے دوبارہ علی سے اس کے اخبار کے پراجیکٹ کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے انہیں

اس پراجیکٹ کی ساری تفصیلات بتائیں۔ اس ضمن میں اٹھائے گئے اقدامات کے بارے میں انہیں بتایا۔ میئرِ شہر سے اس سلسلے میں ہونے والی ملاقات اور اسی دن فوجیوں کے ہاتھوں اپنے دوستوں کے اٹھائے جانے سے لے کر میجر امجد کے ذریعے ان کی رہائی کی بابت انہیں بتایا۔

زرینہ علی کی باتیں پورے انہماک کے ساتھ سن رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ وہ اس وقت علی کے ساتھ کیوں نہیں تھی جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اسے قدرے غصہ بھی آرہا تھا کہ محض اخبار نکالنے کی بات کرنے پر میئر اور مارشل لا کی انتظامیہ نے مشترکہ طور پر کس طرح علی اور اس کے ساتھیوں کی ہمت توڑنے کے لیے ان کے خلاف ایسے اقدامات کئے تھے جن کی قانون میں گنجائش نہیں تھی۔ آخر اس سے نہیں رہا گیا اور وہ بول اٹھی:

-" ماموں اس کرنل کے خلاف ایسا غیر قانونی کام کرنے کی وجہ سے کیا کوئی قانونی کاروائی نہیں کی جاسکتی؟"

"نہیں زری اس کرنل کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جاسکتی۔ مارشل لا کا مطلب ہی فوجیوں کو قانون سے ماوراکام کرنے کی کھلی چھٹی ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ان کے خلاف اگر ہم کسی عدالت میں جائیں گے تو عدالت ہمارا کیس نہیں سنے گی۔ اگر سنے گی تو کوئی کاروائی نہیں کرے گی کیونکہ اس کی کاروائی ان فوجیوں کے حوالے سے غیر موثر رہے گی۔"

پھر وہ دوبارہ علی سے مخاطب ہوئے:

"علی پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ کیا تم اب بھی اخبار جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہو یا کچھ اور پلان ہے؟"

" سچ پوچھیں تو یہ سب کچھ اتنی تیزی کے ساتھ ہوا ہے کہ"، اس نے اپنے دوستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "مجھے اپنی کیبنٹ کے ساتھ مشورہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان سب واقعات کے بعد ہم پہلی بار یہاں بیٹھے آپ کی موجودگی میں اخبار پراجیکٹ کی بات کر رہے ہیں۔"

عمران اور جبران بھی علی کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے علی سے سوال کر ڈالا:

"لیکن علی بھائی یہاں کتنے لوگوں کو اخبار پڑھنا آتا ہے؟ اگر آپ اخبار نکالتے بھی ہیں اور معاشرے کے صرف چار پانچ فیصد لوگ اخبار پڑھتے ہیں تو وہ تو کوئی انقلاب لانے سے رہے۔ اسٹیٹ پاور پر فوجیوں کا قبضہ ہے اتنی تھوڑی تعداد میں اخبار پڑھنے والے لوگ اس پاور کو کیسے مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ غیر آئینی اور غیر قانونی کاموں سے باز رہے؟"

علی نے عمران اور جبران کی بات سنی تو کہا:

"تمہارا سوال بہت اہم ہے۔ لیکن اس سوال کی تفصیل میں جائے بغیر میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہزار میل کا سفر بھی پہلے اٹھنے والے قدم سے شروع ہوتا ہے۔ اگر آپ پہلا قدم نہ اٹھائیں تو ہزار میل تو کجا آپ ایک میل کا سفر بھی نہیں کر سکتے۔

اگر ہم یہ سوچ کر کہ ان قوتوں کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا، خاموشی کے ساتھ بیٹھ جائیں تو پھر ان قوتوں کے غیر آئینی اور غیر قانونی کاموں کو کون روکے گا؟"

یہ باتیں ابھی جاری تھیں اور سب چاہتے تھے کہ یونہی بیٹھے رہیں اور یہ باتیں چلتی رہیں لیکن نیند رفتہ رفتہ سب کی آنکھوں میں اتر رہی تھی۔

علی نے چوہدری فیض سے معذرت چاہی اور جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے محبت سے زرینہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ علی تمہیں جانے کی اجازت دینا یا نہ دینا زری کا کام ہے۔

زرینہ نے بھی خواب بھری نظروں سے علی کی طرف دیکھا اور کہا: "ٹھیک ہے۔ اب بہت دیر ہو رہی ہے۔" پھر اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ علی اور اس کے دوستوں کو ان کے گھر چھوڑ آئے۔ علی اور اس کے دوست سب کو شب بخیر کہہ کر گاڑی میں بیٹھے تو زرینہ اور اس کے ماموں اپنی فیملی کے ساتھ اس وقت تک باہر برآمدے میں کھڑے رہے جب تک گاڑی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

فصل 19

ایوب خان کے مارشل لانے ملک کو ایک ایسی ڈگر پر ڈال دیا تھا جس سے لوگ پہلے سے آشنا نہیں تھے۔
کچھ وہ لوگ تھے جو مارشل لا کے کھلم کھلا خلاف تھے۔ حسین شہید سہروردی ان لوگوں کے سرخیل تھے۔ علی اور اس کے دوست حسین شہید سہروردی کی تائید کرتے تھے۔
کچھ لوگ تھے جو مارشل لاَ لگانے والوں کے ساتھ مل گئے تھے اور دن رات ان کی حمایت میں پراپیگنڈہ کرتے تھے۔
کچھ لوگ تھے جو عاشقی میں عزتِ سادات بچائے رکھنے کے قائل تھے۔ دل سے مارشل لاَ کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن کھلم کھلا اس کی مخالفت بھی نہیں کرتے تھے۔
یہ تقسیم ساری پاکستانی سوسائٹی میں تھی۔ ان میں سے ہر قبیل کے لوگ ہر طرح کے سوشل گروپ میں پائے جاتے تھے۔ سیاست دانوں، وکیلوں، صحافیوں، مزدورں، کسانوں، طالب علموں اور عام لوگوں میں یہ تقسیم واضح طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔
اتفاق سے زرینہ اور اس کے ماموں بھی علی اور اس کے دوستوں کی طرح مارشل لاَ کو ناپسند کرتے تھے اور ملک میں آئین اور قانون کی بالادستی دیکھنا چاہتے تھے۔
زرینہ نوجوان ہونے کی وجہ سے زیادہ جوش وجذبے کے ساتھ پاکستان کے سیاسی افق پر نمودار ہونے والے بُھوت کے خلاف آواز اٹھانے کے حق میں تھی لیکن چوہدری فیض قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اقدامات کرنے کے حامی تھے۔
ان کا نقطہ نظر تھا کہ فوجی حکومتیں انتہائی متشدد ہوتی ہیں اور سادہ لوح لوگ اپنی سادگی کی وجہ سے ان کے ظلم وستم کا تختہ مشق بن جاتے ہیں۔

وہ صرف ایک نامی گرامی وکیل ہی نہیں تھے ان کی بین الاقوامی حالات وواقعات پر بھی گہری نظر تھی۔ اُنہیں خوب اندازہ تھا کہ لاطینی امریکہ اور افریقہ میں فوجی انقلابات کے نتیجے میں وہاں کتنا خون بہا ہے اور لوگوں پر کیا کیا ستم ڈھائے گئے۔

جب بھی ان کی زرینہ، عمران اور جبران سے اس مسئلے پر بات ہوتی وہ اُنہیں ہمیشہ یہی کہتے کہ صحت مند نظریات رکھنا بہت ضروری ہے اور اصولی چیزوں پر اسٹینڈ لینا بھی اہم ہے لیکن کسی چیز کی حمایت یا مخالفت کسی ایسے طریقے سے نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے نتیجے میں انسان کی اپنی سلامتی خطرات سے دوچار ہو جائے۔

ڈنر پر ان سے ہونے والی بات چیت کو علی نے پوری توجہ سے سنا تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اخبار پراجیکٹ پر ایک بار پھر اپنے دوستوں اور حامیوں کے ساتھ تبادلہ خیال کرے۔

چنانچہ اگلے دن جب اس کی صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر سے ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے کہا گزشتہ چند دن کے واقعات میں اخبار پراجیکٹ پر ان کی بات چیت نہیں ہو سکی۔ اور وہ چاہتا ہے کہ آج اس مسئلے پر نئے رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں تفصیلی بات چیت کی جائے۔

سب نے کہا یہ بہت اچھا خیال ہے۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم کوئی ایسا کام کریں جس سے ملک میں آئین اور قانون کی بالادستی قائم کرنے میں مدد مل سکے۔

اخبار ایک بہت اچھا ذریعہ ہے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کا۔ لوگوں کی سوچ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا۔ اور لوگوں کو ایسے کام پر آمادہ کرنے کا جس سے ملک میں وہ تبدیلیاں لائی جا سکیں جن کے نتیجے میں ملک ایک ترقی پسند جدید ریاست بننے کے راستے پر چل نکلے۔

"لیکن اس دن کے فوجیوں کے ہمارے ساتھ سلوک سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ہمیں نارمل طریقے سے کوئی کام نہیں کرنے دیں گے۔" صفدر شاہ نے علی کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں ایک چیز جس کی ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ فوجیوں کی طاقت اس چیز میں ہے کہ ملک میں آئین نہ بننے پائے۔ اور اگر بنے تو اسے چلنے نہ دیا جائے۔ جیسا کہ اسکندر مرزا نے کیا ہے۔ فوجیوں کے ساتھ وہ لوگ بھی اس کام میں شامل ہو جاتے ہیں جو آئین کی موجودگی میں اپنی خلاف قانون سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے۔" علی نے صفدر شاہ کی بات کی وضاحت کی۔

"اصل میں حکمران قوتیں جنگلی گھوڑوں کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ بغیر قدغن چلنے پھرنے میں آسودگی محسوس کرتی ہیں۔ لیکن ان کی اس آزاد روی کی وجہ سے معاشرے تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہذا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان جنگلی گھوڑوں کو سدھایا جائے۔ ان کو آئین کی لگام ڈالی جائے تاکہ وہ ہمیشہ معاشرے کی بہتر انداز میں خدمت بجالائیں۔" علی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہمیں ان جنگلی گھوڑوں کا کیا کرنا ہے جو وردی پہن کر اب شہروں میں گھس آئے ہیں؟" سلیم موٹے نے علی سے پوچھا۔

"جب میں نے اخبار نکالنے کی بات کی تھی تو اس سے میرا یہی مقصد تھا کہ ہم ان گھوڑوں کو آئین کی لگام ڈالنے کے لیے عوام کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ابھی سے انہیں بیرکوں میں واپس بھجوانے کے لیے دباؤ ڈالیں اگر یہ ٹک گئے تو ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔" علی نے سلیم موٹے کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ صحن میں بچھی کرسیوں پر بیٹھے یہ بات کر رہے تھے کہ زرینہ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

زرینہ کو دیکھتے ہی علی کا وہ حال ہوا جو دھوپ چڑھے سو کر اٹھنے والے کا سورج کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

"کیا چل رہا ہے سب دوستوں میں۔ لگتا ہے کسی خاص مسئلے پر سوچ بچار ہو رہا ہے؟"

"ہاں بھابی ہم اخبار پراجیکٹ پر بات کر رہے تھے۔" سلیم موٹے نے زرینہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ یہ بتائیں کیا آپ کچھ چائے وغیرہ لیں گی؟"

"اس سے بہتر خیال کیا ہو سکتا ہے؟ اگر گرما گرم چائے کا ایک کپ مل جائے تو شاید میں بھی آپ کی دانشورانہ گفتگو کو سمجھ سکوں اور اس میں اپنا حصہ ڈالنے کے قابل ہو جاؤں۔ لیکن آپ میں سے کسی کو اس ضمن میں اب تک ہونے والی گفتگو کے بارے میں مجھے بتانا ہو گا۔" زرینہ نے سلیم موٹے کی چائے کی پیشکش قبول کرتے ہوئے کہا۔

علی چوہدری فیض کے گھر ڈنر پر اپنے اخبار پراجیکٹ کے بارے میں سب باتیں کر چکا تھا۔ لہذا پس منظر میں جائے بغیر اس نے اس نشت میں ہونے والی باتیں دہرا دیں۔

علی جب تک بولتا رہا زرینہ کی ذہانت سے چمکتی آنکھیں علی کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ جس محویت اور محبوبیت کی ساتھ علی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی باتیں سن رہی تھی لگتا تھا کہ وہ ہر اس چیز میں بھرپور شمولیت کا فیصلہ کر چکی ہے جو علی کرنا چاہتا ہے۔

زرینہ کو علی کا حکمران قوتوں کو جنگلی گھوڑوں سے مشابہہ قرار دینا اور پھر انہیں آئین کی لگامیں ڈال کر عوام کے لیے کارآمد بنانے والی بات بہت اچھی لگی۔ اسے محسوس ہوا علی نے پاکستان کے انتہائی پیچیدہ مسائل اور ان کے حل کو اس ایک سادہ سی مثال میں بیان کر کے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔

علی کی باتیں سن کر زرینہ نے کہا:

"اخبار کا آئیڈیا بہت اچھا ہے۔ لیکں مجھے لگتا ہے کہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہو گا۔"

"اگر ہم اخبار نہیں نکالتے تو پھر ہمیں اس کا کوئی متبادل حل نکالنا ہو گا تا کہ ان بے لگام قوتوں پر کاٹھی ڈالی جاسکے؟" صفدر شاہ نے زرینہ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"اخبار نکالنے کے خیال سے ہمیں اتنی آسانی سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔ میئرِ شہر خواجہ احسن نے کہا تھا کہ وہ محکمہ اطلاعات سے اخبار نکالنے کی اجازت حاصل کرنے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ اگر ہم

اجازت لے کر اخبار نکالتے ہیں تو پھر ہمیں بات کرنے سے کون روک سکے گا؟" علی نے اخبار کے بارے میں دوسرا آپشن پیش کرتے ہوے کہا۔

"اگر آپ اجازت لے کر اخبار نکالیں گے تو وزارتِ اطلاعت اس میں شائع ہونے والے مواد کو کنٹرول کرے گی۔ اس طرح آپ آزادی سے اظہارِ رائے نہیں کر سکیں گے۔" زرینہ نے علی کے اٹھائے گئے نکتے پر رائے دیتے ہوے کہا۔

"ملک میں ملٹری کا اقتدار پر قبضہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس چیلنج سے نپٹنا آسان کام نہیں۔ حسین شہید سہروردی پاکستان بننے سے پہلے متحدہ بنگال کے چیف منسٹر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد قانون ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ اس کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ ان کو ان ملٹری والوں نے گھر پر نظر بند کر رکھا ہے۔ بہت سے اور سیاست دان بھی گھروں پر نظر بند ہیں یا جیلوں میں ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ کوئی نیا قانون لایا جا رہا ہے جس کے ذریعے ان سیاست دانوں کو عمر بھر کے لیے سیاست بدر کر دیا جائے گا۔" زرینہ کی رائے سن کر علی نے بات مزید آگے بڑھائی۔

"علی تم ٹھیک کہتے ہو۔ لگتا ہے اس ملک میں سیاست کو شجر ممنوعہ بنایا جا رہا ہے۔ ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں کہ اصل سیاسی لوگ سیاست سے باہر ہو جائیں اور ان کی جگہ غیر سیاسی لوگوں کو ریاست پر مسلط کر دیا جائے۔

اور اس پر ستم یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ شدید نظریاتی تقسیم کا شکار ہے۔ ملاّ پاکستان کو مذھبی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی جدید ریاستی امور سے نا آگاہی کا حال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں پاکستان کو آئین کی ضرورت نہیں۔ قران ہی ہمارا آئین ہے۔ کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ قران آئین کا متبادل کیسے ہو سکتا ہے۔ آئین ریاست چلانے کی دستاویز ہے جبکہ قران انسانوں کی روحانی معاملات میں راہنمائی کرتا ہے۔ ریاست چلانا ایک سنجیدہ اور پیچیدہ کام ہے۔ ریاست کی صحت پر اس کے شہریوں کی صحت اور سلامتی کا انحصار ہوتا ہے۔ ملاّ اگر ایک انتہا پر ہیں تو مارکسسٹ دوسری انتہا پر ہیں۔ وہ بھی آئین کی بات کرنے کی بجائے انقلاب

کی بات کرتے ہیں۔ حالانکہ پاکستان جیسے ملک میں جس میں حکمران طبقات حکمران طاقتوں کی مدد سے جنگلی گھوڑوں کی طرح ہر چیز کو چراگاہ سمجھتے ہوئے روند ڈالنا چاہتے ہیں ان کو آئین کی لگامیں ڈالنا ضروری ہے۔ایک بار یہ آئین کی حدود کو قبول کرلیں تو رفتہ رفتہ عوام کو حقوق دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

زرینہ یہ باتیں کر رہی تھی تو علی اور اس کے دوست سر نیوڑھائے پوری توجہ اور دلچسپی سے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ اُنہیں تعجب تھا کہ زرینہ کے خیالات میں کتنی روشنی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ زرینہ کی شکل میں انہیں ایک خوبصورت بھابی کے علاوہ ایک واضح اور روشن سوچ رکھنے والی ساتھی بھی مل گئی ہے۔

اظہر جو کہ زرینہ کی باتیں زیادہ انہماک کے ساتھ سن رہا تھا کہنے لگا۔"میرا مشورہ یہ ہے کہ ہمیں فی الحال اخبار کے پراجیکٹ کو نہ ختم کرنا چاہیئے نہ فوراً شروع کرنا چاہیئے۔ ہمیں ابھی تیل اور تیل کی دھار دیکھنی چاہیے۔ بہتر ہوگا ہم اس وقت تک تحمل سے معاملات کا جائزہ لیں جب تک ملڑی حکومت مکمل طور پر اپنے کارڈ ٹیبل پر نہیں رکھتی۔ اپنی اسٹراٹیجی بنانے سے پہلے لازمی ہے کہ ہمیں ان کے عزائم کا مکمل طور پر ادراک ہو۔"

زرینہ نے کہا اسے اظہر کی بات میں زیادہ وزن دکھائی دیتا ہے۔ علی نے کہا: " اگر یوں ہے تو ٹھیک ہے ہم فی الحال اخبار پراجیکٹ پر دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کریں گے اور اس دوران اپنے دوسرے آپشنز پر غور و فکر جاری رکھیں گے۔"

"علی لیکن جو پراجیکٹ ہم نے شروع کیا ہے اس کے بارے میں بھی ہمیں جلد کچھ کرنا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کل ہم گاؤں جائیں اور تم میرے والدین سے مل لو۔ میرے ماموں اور ان کے خانوادے سے تو تم مل ہی چکے ہو۔ ان سب کو تم بہت پسند آئے ہو۔ اب میرے والدین سے بھی مل لوگے تو میرے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی۔" زرینہ نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے، جو حکم سرکار کا، کل ہم سب تمہارے گاؤں جائیں گے۔" علی نے محبت بھرے لہجے میں زرینہ سے اس کے گاؤں جانے کی حامی بھرتے ہوئے جواب دیا۔

فصل20

اگلے دن علی اور اس کے دوست دن چڑھے، صحن میں بچھی کرسیوں پر دھوپ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ چوہدری فیض صاحب کا ڈرائیور آ پہنچا۔

"بی بی نے کہا ہے کہ آپ سب تیار ہو کر میرے ساتھ چلیں انہوں نے آپ کے ساتھ گاؤں جانے کا پروگرام بنار کھا ہے۔" اس نے علی اور اس کے دوستوں کو زرینہ کا سندیسہ دیا۔

سب بھاگم بھاگ چند منٹوں میں تیار ہو کر چوہدری فیض کے ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر جا رہے تھے۔

وہاں پہنچے تو ساری فیملی روانگی کے لیے تیار تھی۔ سوائے زرینہ کے سب نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی شادی پر جا رہے ہوں۔

فیملی کے باقی افراد کے برعکس زرینہ نے گُھڑسواری کا تنگ لباس پہن رکھا تھا۔

علی نے زرینہ کو اس لباس میں دیکھا تو کہا:

"زری جان ہم نے تو گاؤں جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن لگتا ہے ہم کہیں فوج کشی کرنے جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں آج میرا ارادہ کسی ریاست کو فتح کرنے کا ہے۔ دیکھیے آج کیا کچھ تاراج ہوتا ہے۔"

علی نے کہا: " اگر یہ ارادے ہیں تو پھر مجھے بھی تیار رہنا ہو گا۔ آخر اب ہم دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔"

یہی باتیں کرتے چوہدری فیض کی فیملی اور علی کے دوست الگ الگ گاڑیوں پر بیٹھ کر گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ چوہدری فیض اور ان کی فیملی ایک گاڑی میں اور علی اور زرینہ اور ان کے دوست دوسری گاڑی میں سوار تھے۔

زرینہ نے ڈرائیور کو سیدھا گاؤں کی طرف جانے کی بجائے پہلے شہر سے باہر چوہدری فیض کے ڈیرے کی طرف چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے زرینہ کے کہنے پر گاڑی ڈیرے کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ علی اور اس کے دوست زرینہ کی ہدایات پر متعجب تھے لیکن ہلکے ہلکے گاؤں میں متوقع سرگرمیوں کے

بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ زرینہ نے کہا اُنہیں آج واپس لوٹنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیئے۔ بلکہ اگلے چند روز وہیں گزارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیئے۔ سب نے بیک زبان کہا ہم سب تیار ہیں۔ جب تک گاؤں میں رکنا پڑا رکیں گے۔

انہی باتوں میں گاڑی شہر سے باہر چوہدری فیض کے ڈیرے پر جا پہنچی۔

زرینہ نے ڈرائیور سے کہا وہ علی کے دوستوں کو گاؤں لے جائے اور انہیں بتا دے کہ میں اور علی راستے میں ہیں۔

ڈرائیور علی کے دوستوں کے ساتھ روانہ ہوا تو زرینہ نے ڈیرے پر ملازم سے کہا وہ دونوں مشکی گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈال دے۔

ملازم نے چند لمحوں میں دنوں گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈال کر اُنہیں زرینہ اور علی کے سامنے لا کھڑا کیا۔

زرینہ نے علی سے کہا وہ اپنی پسند کے گھوڑے پر بیٹھ جائے۔ ہم سڑک کے راستے جانے کی بجائے نہر کے کنارے گھوڑوں پر گاؤں جائیں گے تو ان سے پہلے پہنچ جائیں گے۔ علی بچپن سے گُھڑسواری کا عادی تھا، زرینہ کا موڈ دیکھتے ہوئے اس نے فوراً چھلانگ لگائی اور گھوڑے پر بیٹھ کر اُسے ایڑ لگائی۔

دوسری طرف زرینہ بھی فوراً چھلانگ لگا کر دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ چند لمحوں میں علی اور زرینہ کے گھوڑے ایک ساتھ نہر کے کنارے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔

علی زرینہ کے تیور دیکھتے ہوئے اپنے گھوڑے کو بار بار ہلکے ہلکے ایڑ لگا کر زرینہ سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ کسی مشّاق جاکی کی طرح رکابوں پر کھڑے ہو کر یوں گھوڑے کو لگاموں سے جھٹکا دیتی کہ گھوڑا جمپ کر کے علی کے گھوڑے سے آگے نکل جاتا۔

وہ اسی طرح ایک دوسرے کو طیش دلاتے اپنا اپنا گھوڑا دوڑاتے رہے۔ کبھی علی آگے نکل جاتا اور کبھی زرینہ۔

نہر کے کنارے ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے کہ اچانک علی کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور علی گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ اتفاق سے علی گھوڑے سے لُڑھک کر سیدھا نہر کے پانی میں جا گرا۔ زرینہ نے علی کو گرتے دیکھا تو فوراًاپنے گھوڑے کو واپس موڑ کر علی کے پاس پہنچ گئی۔

پانی میں گرنے کی وجہ سے علی چوٹ لگنے سے محفوظ رہا۔ اور فوراً تر بتر کپڑوں کے ساتھ نہر سے باہر نکل آیا۔ زرینہ نے پانی سے باہر نکلنے میں اس کی مدد کی۔ وہ شرمندہ تھی کہ اس کی وجہ سے علی کو یہ حادثہ پیش آیا۔

علی کا گھوڑا بھی ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے سنبھل کر وہیں کھڑا رہا۔ علی نے چند لمحے وہیں کھڑے کھڑے اپنے کپڑوں کو پانی سے صاف کیا اور پھر گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ گھوڑے نے چلنا شروع کیا تو وہ لنگڑا رہا تھا۔ علی نے گھوڑے کو لنگڑاتے دیکھا تو زرینہ سے کہا یہ گھوڑا اس کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔ اگر وہ اس پر بیٹھ کر اسے چلاتا رہا تو یہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جائے گا۔

زرینہ نے کہا اس کا ایک ہی حل ہے کہ وہ اس کے ساتھ اس کے گھوڑے پر اس کے پیچھے بیٹھ جائے۔ علی نے کہا تو میرے والے گھوڑے کا کیا کریں۔ اس نے کہا یہ واپس ڈیرے پر چلا جائے گا۔ زرینہ نے گھوڑے کی لگامیں اتار کر اس کی کاٹھی کے ساتھ باندھ کر کانوں کے نیچے پیار کرتے ہوئے اسے ڈیرے کی طرف دھکیل دیا۔ خود وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ گئی اور علی اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔

دونوں گھوڑے کو دُلکی چال چلاتے گاؤں کے قریب پہنچے تو علی نے کہا یہ تو چوہدری فراغت حسین کا علاقہ ہے۔

جی ہاں یہی ہمارا گاؤں ہے۔ یہ علاقہ یقیناً چوہدری فراغت حسین کا ہے۔ چوہدری فراغت حسین میرے والد ہیں اور میں ہوں ان کی اکلوتی بیٹی زرینہ اور تمہاری ہونے والی بیوی۔

زرینہ کے اس انکشاف پر علی زور زور سے ہنسنا شروع ہو گیا۔ زرینہ نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو وہ اور زور سے ہنسنے لگا۔ زرینہ اس کے ہنسنے کی وجہ نہ جاننے کے باوجود اس کے ساتھ ہنسنا شروع ہو گئی۔

جیسے ہی ان کا گھوڑا گاؤں کی حدود میں داخل ہوا تو اُنہیں گاؤں میں بے شمار گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ چند ایک ہالی کاپٹر بھی گاؤں کے باہر موجود تھے جن کے ساتھ چاک و چوبند فوجی کھڑے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔

جیسے جیسے وہ چوہدری فراغت حسین کی حویلی کی طرف بڑھے انہوں نے سنا وہاں فوجی بینڈ نفیریوں پر شادی کی دُھنیں بجا رہا تھا۔ حویلی پر پہنچے تو وہاں شادی کا سماں تھا۔ زرینہ کے والد چوہدری فراغت حسین اور ان کی بیگم اور علی کے والد چوہدری محمد حسین اور ان کی بیگم بے شمار مہمانوں کے ساتھ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے ان کے منتظر تھے۔

زرینہ کے ماموں اور علی کے دوست بہت پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ علی کے والدین اور باقی سارے مہمان بھی کوئی آگے کوئی پیچھے، کوئی ہالی کاپٹر پر کوئی گاڑی پر اور کوئی گھوڑے پر وہاں پہنچ رہا تھا۔ حکومت پاکستان کے سب وزرا، گورنر، سارے نامی گرامی سیاست دان، سارے جرنیل، سب انگریزی اور اردو اخباروں میں لکھنے والے کالم نگار اور صحافی وہاں موجود تھے۔

قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح بھی تشریف لا رہی تھیں۔ اور ان کا شدت کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ وہ ائیر پورٹ سے بذریعہ ہالی کاپٹر پہنچ رہی تھیں۔

اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنے بڑے پیمانے پر فنکشن کا سارا سہرا زرینہ کے ماموں چوہدری فیض کے سر تھا۔ وہ پہلے سے جانتے تھے کہ علی کے والد چوہدری محمد حسین اور زرینہ کے والد چوہدری فراغت حسین چاہتے تھے کہ دونوں کی شادی ہو جائے۔ اس ضمن میں دونوں پہلے ایک دوسرے سے بات چیت کر چکے تھے۔ صرف انہیں دونوں کی رضامندی درکار تھی۔

جس رات زرینہ نے اُنہیں علی سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا تھا اور عندیہ دیا تھا کہ علی اور اس نے ایک ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے اسی وقت انہوں نے چوہدری محمد حسین اور چوہدری فراغت حسین کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ شادی کی فوراً تیاری کریں کیونکہ علی اور زرینہ زیادہ انتظار کرنے کے مُوڈ میں دکھائی نہیں دیتے۔

اس کے علاوہ انہوں نے دوستوں کو اسپیشل ہدایات کے ساتھ دعوت دی کہ وہ سب حلقوں میں چوہدری محمد حسین اور چوہدری فراغت حسین اور ان کے جاننے والوں کو مطلع کر دیں کہ آج پچھلے پہر علی اور زرینہ کی شادی ہو رہی ہے۔

چوہدری محمد حسین اور چوہدری فراغت حسین اور خود چوہدری فیض کا علاقے میں جو اثر و رسوخ تھا اس کی وجہ سے ہر جانا پہچانا پاکستانی لیڈر وہاں پہنچ چکا تھا یا پہنچ رہا تھا۔

علی نے زرینہ سے کہا: "تم پوچھ رہی تھیں نا کہ میں ہنس کیوں رہا تھا۔ ہنسنے کی وجہ یہ تھی کہ چند ہفتے قبل بڑے چوہدری صاحب نے تمہارے والد کے حوالے سے کہا تھا کہ میں ان کی بیٹی سے شادی کر لوں تو میں نے کہا تھا کہ میں ذرا سوچوں گا۔ لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ جس پھول کی خوشبو نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ چوہدری فراغت حسین کی اکلوتی بیٹی ہے جس سے بڑے چوہدری صاحب میری شادی کرنا چاہتے تھے۔'

"لیکن علی جب تم ہنس رہے تھے تو تم نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ میں کیوں ہنس رہی تھی۔ جس دن تم مجھے ملے تھے اور میں نے تمہارے بارے میں ماموں جان کو بتایا تھا تو انہوں نے جب ہی مجھے بتا دیا تھا کہ تم چوہدری محمد حسین کے بیٹے ہو اور میرے والد چاہتے ہیں کہ میری تم سے شادی ہو جائے۔"

"اور وہ جو فیکٹری کے باہر ہم علی الصبح ملے تھے اور پھر اکٹھے بیٹھ کر چائے پی تھی؟" علی نے شرارت سے پوچھا۔

"وہ محض ایک حسین اتفاق تھا۔ تب تک نہ تم مجھے جانتے تھے اور نہ میں تمہیں۔ لیکن آسمان کی وسعتوں میں تیرتے ہمارے ستارے پہلے ہی ایک دوسرے کے ساتھ مل رہے تھے۔"

اس بات پر دونوں پھر بے تحاشا ہنستے ہوئے گھوڑے سے اُترے تو دونوں کے ماں باپ نے دونوں کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور دونوں کی پیشانیوں پر بوسہ دیا۔ ملڑی بینڈ کی شادی کی دُھنوں سے ساری فضا بھر گئی۔

اتنی دیر میں سب نے دیکھا عین حویلی کے سامنے کھلی زمین پر محترمہ فاطمہ جناح کے ہیلی کاپٹر نے لینڈ کیا۔

چوہدری محمد حسین، چوہدری فراغت حسین، چوہدری فیض نے آگے بڑھ کر محترمہ کا استقبال کیا۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اپنے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ سجائے حویلی میں داخل ہوئیں تو وہاں موجود سب چاک وچوبند فوجی افسروں نے اُنہیں سلیوٹ کیا۔ سیاست دانوں نے اُنہیں سر جھکا کر سلام پیش کیا۔ گاؤں کی بچیوں اور بچوں نے اُن پر پھول نچھاور کیئے۔ وہ باوقار انداز میں چلتی حویلی کے گارڈن میں بچھے کارپٹوں پر رکھی گئی کرسیوں میں سے اپنی مخصوص کرسی پر جا کر بیٹھ گئیں۔

علی اور زرینہ تھوڑی دیر میں دلہا دلہن کے لباس میں ملبوس اپنی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ دونوں دلہا دلہن کے لباس میں پہلو بہ پہلو بیٹھے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے کنول کے دو پھول جھیل کے پانی پر ساتھ ساتھ تیر رہے ہوں یا آسمان کے دو ستارے ایک ساتھ چمک رہے ہوں۔

گاؤں کے مولوی صاحب نے چوہدری محمد حسین اور چوہدری فراغت حسین کی اجازت سے دونوں کا نکاح خوانی کا مرحلہ طے کیا تو ہر طرف ساری حویلی مبارک مبارک کی صداؤں سے گونج اٹھی۔

فصل 21

علی اور زرینہ کا تعلق اس نسل سے تھا جس نے پاکستان کا خواب نہیں دیکھا تھا لیکن اس خواب کو حقیقت بنانے میں اس نسل کی مدد کی تھی جس نے یہ خواب دیکھا تھا۔

یہ وہ نسل تھی جو قرار دادِ پاکستان سے چند سال قبل پیدا ہوئی جس نے دیہاتوں اور شہروں کے گلی کوچوں میں "بٹ کے رہے گا ہندوستان بن کے رہے گا پاکستان" کے نعرے لگا کر اس نسل کے خوابوں کو حقیقت بنانے میں مدد کی تھی جو برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک نئی ریاست کی تخلیق کا خواب دیکھ رہی تھی۔

پاکستان ایک حقیقت کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھر چکا تھا اور اب اس نسل اور اس سے بعد آنے والی نسل کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس حقیقت کے خدوخال کی اس طرح تزئین و آرائش کرتے کہ پاکستان ایک مثالی ملک بنتا۔

علی اور زرینہ کی نسل کے لیے پاکستان کو پٹڑی سے اترتے دیکھنا ایک تکلیف دہ امر تھا۔ خاص طور پر ایسے وقت پاکستان کا پٹڑی سے اترنا جبکہ ان کے ولولے جوان تھے، بازوؤں میں طاقت تھی اور زندگی کی جولاں گاہ میں جاری تگ و تاز میں نبرُد آزمائی کے لیے وسائل بھی میسر تھے۔ پاکستان کا یوں آئین و قانون کے راستے سے بھٹک جانا انہیں قبول نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے اگر ایک بار پاکستان لاقانونیت کی دلدل میں اتر گیا تو پھر کبھی اس سے باہر نہیں آ سکے گا۔

جب علی اور زرینہ اور ان کی نسل کے لوگ پاکستان کے زمینی حقائق دیکھتے اور پھر ملک میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے طرف سے پیش کردہ حل کی طرف دیکھتے تو پریشان ہو جاتے۔ ایک طرف بنیاد پرست تھے جو پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ ان کے لیے نہ پاکستان اہم تھا نہ پاکستانی۔ فقط اہم

تھا تو اسلام۔ ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا آئیڈیل تھا جس کے سامنے ملک، قوم، عوام ہر چیز بے معنی تھی۔ ان میں سے کئی لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر اسلام کی خاطر قوم و ملک کو قربان کرنا پڑے تو کر دینا چاہیئے۔ یہ سوچ مولانا مودودی کے اسلامی نظام حکومت کے نظریئے کی ترویج واشاعت کے بعد ابھر رہی تھی۔ مولانا مودودی پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کے سخت خلاف تھے۔ قائدِ اعظم کو کافرِ اعظم کہتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے ساری توجہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے پر لگا دی۔ اس مقصد کے لیے وہ ہر اس کام کو جائز تصور کرتے تھے جس سے ملک میں ان کے نظریات پر مبنی بنیاد پرست حکومت قائم ہونے کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔

علی اور زرینہ اگرچہ مذہب کے خلاف نہیں لیکن وہ کٹر مذہب پرست بھی نہیں تھے۔ البتہ انہیں اس بات سے سخت اختلاف تھا کہ مذہب کو سیاست میں دخل اندازی کی اجازت دی جائے۔ ان کے نزدیک اسلام کو سیاست میں دخل اندازی کی اجازت دینے کا مطلب تھا ریاست پر ملاؤں کی بالادستی۔ وہ اس بات کے خلاف تھے کہ کسی ایک خاص طبقے کو ریاستی امور پر بالادستی حاصل ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ ریاست ایک بہت بڑا گھر ہے جس میں کروڑوں لوگ اکٹھے زندگی گزارتے ہیں۔ اس لیے کسی ایک خاص نظریے یا طبقے کی بالادستی کی بجائے یہ گھر چلانے میں سب کی آزادانہ رائے شامل ہونے سے اس بڑے گھر کا نظام بہتر انداز میں چلایا جا سکتا ہے۔

زرینہ تو یہاں تک کہتی تھی کہ جو ریاست لوگوں کو اپنی مرضی کے کپڑے پہننے کی اجازت نہ دے وہ کبھی پھل پھول نہیں سکتی۔ ایسے ناروا نظام پر مبنی ریاستیں اپنے شہریوں کی شخصیات کی نشو و نما میں حائل ہونے لگتی ہیں۔ جس کے نتیجے ان ریاستوں میں قائم معاشرے گھٹن کا شکار ہو کر بکھر جاتے ہیں اور ایسی ریاستیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر تاریخ کے کوڑے دان کا حصہ بن جاتی ہیں۔

وہ یہ بھی کہتی تھی کہ انسان، مرد اور عورتیں، اس وقت بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں جب انہیں معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کی مکمل آزادی ہو۔

علی زندگی میں کبھی کبھار مصلحت پسندی سے کام لینے کو معیوب نہیں سمجھتا تھا لیکن اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کے وہ بھی سخت خلاف تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہتا اگر بطور حربہ کبھی مصلحت سے کام لینا پڑے تو اس میں حرج نہیں لیکن اگر کبھی کسی بنیادی اصول کی قربانی دینی پڑے تو پھر کبھی مصلحت کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ اور آدمی کو اپنے اصولوں پر ڈٹ جانا چاہیئے۔

شادی کا جمگھٹا چُھٹا تو علی اور زرینہ نے سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر شروع کیا کہ وہ پاکستان کی کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ اسے لاقانونیت کے راستے پر گامزن ہونے سے کیسے روک سکتے ہیں؟ کس طرح اُسے دوبارہ ترقی اور خوشحالی کے راستے پر ڈال سکتے ہیں؟

علی کے والد چوہدری محمد حسین اور زرینہ کے والد چوہدری فراغت حسین کا خیال تھا کہ علی اور زرینہ کو کھیتی باڑی کے کام پر توجہ دینی چاہیئے۔ علی اگر چوہدری محمد حسین کی اکلوتا بیٹا تھا تو زرینہ چوہدری فراغت حسین کی اکلوتی بیٹی تھی۔

دونوں چوہدری صاحبان اب عمر کے اس حصے میں تھے جب انسان فراغت کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینا چاہتا ہے، دوستوں کی ساتھ گپ شپ کرنا چاہتا ہے یا ہیر وارث شاہ یا میاں محمد بخش کے کلام سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

چوہدری محمد حسین کی سیاست میں عدم دلچسپی کے باوجود ان کے آبائی اثر و رسوخ کی وجہ سے ملک بھر کی سیاسی قوتوں سے ان کا رابطہ قائم تھا۔

ان کی وجہ سے علی بھی پاکستان کے ہر نامی گرامی لیڈر سے ذاتی طور پر شناسا تھا۔ یہ شناسائی صرف سیاسی شخصیات تک محدود نہیں تھی۔ پاکستان بھر کے کاروباری اور فکری حلقے سب علی کے خاندان کے سیاسی پس منظر کی وجہ سے اسے جانتے تھے۔

چوہدری فراغت حسین بھی چوہدری محمد حسین کی ٹکر کے زمین دار تھے۔ ان کا شمار بھی پاکستان کی با اثر شخصیات میں ہوتا تھا۔ علی کی طرح زرینہ کی شخصیت بھی جانی پہچانی تھی۔ اس کا خوبصورت نسائی حسن بھی دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔

چوہدری فراغت حسین کے جاننے والے عسکری اور سول حلقوں میں سے زرینہ کے لیے کتنے ہی رشتے آئے تھے لیکن ان کی ترجیح تھی کہ کسی زمیندار گھرانے میں اس کی شادی ہو۔

علی کے ساتھ زرینہ کی شادی سے وہ بہت خوش تھے۔ خاص طور پر جس طرح ان کی شادی کے واقعات رونما ہوئے تھے اس سے دونوں خاندانوں کا خیال تھا کہ ان کی جوڑی صحیح معنوں میں آسمانوں پر بنی ہے۔

شادی کے بعد ابھی تک علی اور اس کے دوست زرینہ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔

گاؤں کا کھلا ماحول، دور تک پھیلے ہوئے ہریالے کھیت اور شیشے کی طرح شفّاف نیلا آسمان اور پرندوں کی چہچہاہٹ سب اتنا خوبصورت تھا کہ علی اور زرینہ اور ان کے دوست ابھی کچھ عرصہ یہیں رہنا چاہتے تھے۔

علی کے ہاسٹل منتقل ہونے کے بعد شہری زندگی اس کے مزاج کا حصہ بن چکی تھے۔ یہی حال زرینہ کا تھا۔ پڑھائی کے لیے جب وہ شہر میں اپنے ماموں فیض کے گھر منتقل ہوئی تھی تو رفتہ رفتہ گاؤں اس کے اندر دم توڑ گیا تھا اور شہر کی صنعتی فضاؤں نے اس کے ذاتی شعور میں زندگی کو نئے معنی پہنا دیئے تھے۔

اس پر طُرہ یہ کہ چوہدری فیض کا گھر بھی شہر کی علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ کوئی دن نہیں جاتا تھا جب ان کے علمی ادبی اور سیاسی دوست ان کے گھر نہ آتے ہوں۔

کبھی شعر و شاعری کی محفلیں جمتیں تو کبھی سیاسی دوستوں کی وجہ سے زبردست سیاسی بحثیں اس شدّ و مد سے چِھڑتیں کہ کسی کو رات ڈھلنے کا احساس نہ ہوتا۔ ایسے میں ان کے اکثر دوست صبح کی اذان کے وقت اپنے گھروں کو سدھارتے۔

زرینہ کے ماموں فیض کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کے حلقے میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ خاص طور پر آزاد خیال اور ترقی پسند لوگوں کے ساتھ ان کی زیادہ دوستی تھی۔ کبھی کبھار غلطی سے ان کے کسی دوست کے ساتھ اگر کوئی مذہبی خیالات رکھنے والا مہمان آجاتا تو پھر بحث میں مذہب کا عنصر بھی شامل ہو جاتا تھا۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا۔

علی کے ہاسٹل اور زرینہ کے ماموں فیض کے گھر کے ماحول میں دونوں کے اندر گاؤں پس منظر میں جا چکا تھا اور شہر پوری توانائی کی ساتھ ان کی شخصیات میں آگے آچکا تھا۔ یہی وجہ تھی گزشتہ چند دن سے گاؤں میں واپسی کے بعد گاؤں ان کی شخصیات میں پھر انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ اور دونوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ عرصہ گاؤں میں ہی قیام کریں۔

صفدر شاہ اور سلیم موٹا خالصتاً شہری مخلوق تھے۔ گاؤں میں رہنے کا ان کا تجربہ قدرے نیا تھا۔ وہ گاؤں کی زندگی سے مانوس نہیں تھے۔ لیکن اظہر گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس لیے اُس کے لیے گاؤں میں رہائش پذیر ہونے میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ صفدر شاہ اور سلیم موٹا شہری مخلوق ہونے کے باوجود گاؤں میں اپنے قیام سے کافی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گزشتہ چند دنوں سے ان کے اعصاب کا تناؤ ختم ہو چکا ہے اور وہ گاؤں کی صاف ستھری فضاؤں میں ایک عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

زرینہ، صفدر شاہ اور سلیم موٹے کو ان کے شہری پس منظر کی وجہ سے گاؤں کے معاملات کے حوالے سے اکثر امتحان میں ڈالتی رہتی۔ جن میں وہ بے چارے اکثر فیل ہو جاتے اور یوں علی، زرینہ اور اظہر کی تفریحِ طبع کا سبب بنتے۔

اگرچہ زرینہ کے والد چوہدری فراغت حسین کی حویلی میں خواب گاہیں اور باتھ روم جدید سہولیات کے حامل تھے لیکن علی اور اظہر کے ساتھ صبح اٹھ کر کھیتوں میں واقع ڈیرے پر جانا۔ صبح کی ہوا کھانا، کیکر کی مسواک کرنا اور ٹیوب ویل کے پانی سے نہانا صفدر شاہ اور سلیم موٹے کو بہت اچھا لگتا۔

پھر دن چڑھے گاؤں کے لوگوں کا چوہدری فراغت حسین سے ملنے ڈیرے پر آنا، چار پائیوں پر اکٹھے بیٹھ کر حقہ گڑ گڑانا، گاؤں بھر کے معاملات جن میں گھریلو مسائل کے علاوہ تھانے کچہری کے چھوٹے موٹے معاملات بھی شامل ہوتے، پھر باہمی گفتگو کرنا اور انتہائی تدبر اور سادہ دیہاتی منطق کے ساتھ ان معاملات کو سلجھانا علی اور اظہر کے لیے معمول کی باتیں تھیں لیکن صفدر شاہ اور سلیم موٹے کو یہ سب عجیب محسوس ہوتا۔

وہ کئی سالوں سے علی کے ساتھ تھے اور اس کی شخصیت میں ایک خاص ٹھہراؤ کو اس کی ایک بہت بڑی طاقت سمجھتے تھے۔ چوہدری فراغت حسین کے ڈیرے پر مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں وہ ٹھہراؤ تقریباً سبھی افراد میں دکھائی دیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ علی کی شخصیت کی یہ اہم خصوصیت کہاں سے آئی تھی۔

ایک دن بڑے چوہدری صاحب علی اور زرینہ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ چوہدری فراغت حسین کے ساتھ وہ بھی ڈیرے پر بیٹھے حقہ گڑ گڑا رہے تھے۔ علی اور اس کے سب دوست بھی ڈیرے پر موجود تھے۔ اُنہوں نے علی سے اس کے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں پوچھا۔ علی نے کہا وہ زرینہ کے ساتھ پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں کو بہتر طور پر جاننے کے لیے ایک تفصیلی سفر کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں جن لوگوں سے اُن کے خاندانی مراسم ہیں اُن کے علاقوں میں جا کر اُن مراسم کو مزید مستحکم کرے۔ اور اُن کی وساطت سے یا براہ راست اور زیادہ لوگوں سے ملے۔ ان کے ساتھ تبادلہ خیال کرے۔ ان کے مسائل سمجھے۔ ان سے ان مسائل کے حل کے بارے میں ان کا نقطہ نظر معلوم کرے۔

چوہدری محمد حسین اور چوہدری فراغت حسین نے علی کے مستقبل کے منصوبے سنے تو اُنہیں کچھ تعجب ہوا اور کچھ فکر لاحق ہوئی۔ علی اگر چوہدری محمد حسین کا اکلوتا بیٹا تھا تو چوہدری فراغت حسین کی اکلوتی بیٹی زرینہ کا خاوند ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا اکلوتا متوقع وارث بھی تھا۔

ایک جیسا پس منظر اور ایک جیسی صورت حال سے دوچار ہونے کی وجہ سے چوہدری محمد حسین اور چوہدری فراغت حسین کی سوچیں بھی تقریباً ایک جیسی تھیں۔ لیکن دونوں کو ایک بات پر کافی اطمینان تھا کہ علی اور زرینہ دونوں بہت اسمارٹ تھے اور ان دونوں کے لیے اکٹھے زمینداری کے معاملات چلانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

علی کے دوست جس طرح اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے اس سے بھی دونوں چوہدریوں کو خاصا اطمینان تھا۔ چوہدری محمد حسین نے صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر کو ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ علی کو دیکھتے تھے۔

چوہدری فراغت حسین نے اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے جس طرح زرینہ کی تربیت کی تھی اسے علی کے دوستوں کو خاندان کا حصہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ وسائل کی کوئی ایسی کمی نہیں تھی کہ تین افراد ان کے لیے کسی قسم کا بوجھ بنتے۔

علی کے جواب پر چوہدری محمد حسین نے اس سے سوال کیا کہ پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں پھرنے پھرانے اور لوگوں سے ملنے ملانے کے لیے اسے کتنا وقت درکار ہے۔

علی نے کہا اس میں چند ماہ بھی لگ سکتے ہیں اور چند سال بھی۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ جہاں جائے وہاں کچھ وقت گزارے اور ہر جگہ دوستوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کرے جو ملکی سیاست میں اس کے ساتھ مل کر اہم کردار ادا کر سکیں۔

چوہدری فراغت حسین نے علی اور چوہدری محمد حسین کی باہمی گفتگو سنی تو علی سے مخاطب ہو کر بولے علی تم فیڈرل کیبنٹ میں کیوں شامل نہیں ہو جاتے؟

ایوب خان کے قریبی جرنیلوں میں سے کتنوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان کے ساتھ مل جاؤں تو وہ مجھے وفاقی وزیر بنا سکتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے کئی بار ان سے معذرت کی ہے۔

علی نے چوہدری فراغت حسین سے پوچھا کیا انہوں نے اس ضمن میں کبھی اپنے برادرِ نسبتی چوہدری فیض سے بات کی ہے۔ہاں کئی بار بات ہوئی ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ یہ حکومت غیر قانونی ہے اور کسی غیر قانونی سیٹ اپ کا حصہ بننا قوم کے ساتھ تو زیادتی ہے ہی اپنے اوپر بھی ظلم کرنے کے برابر ہے۔

علی نے کہا اسے چوہدری فیض صاحب کی بات سے مکمل اتفاق ہے۔چوری اور ڈاکے کی کامیابی کا امکان چاہے کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو اس کا حصہ بننا قانون اور اصول کے خلاف ہے۔یہ لوگ جو ایوب خان کی کیبنٹ کا حصہ بنے ہیں یہ سب مفاد پرست، بے اصول اور بد دیانت لوگ ہیں۔یہ آئین یا قانون پر یقین نہیں رکھتے۔ محض اقتدار کا حصول ان کا مطمع نظر ہے۔اور یہ چیز پاکستان کے مستقبل کے لیے ٹھیک نہیں۔اس سے ہم پاکستان میں ایک ایسے نظام کی بنیادیں رکھنے جا رہے ہیں جو آخر کار پاکستان کو تباہ و برباد کر دے گا۔

چوہدری محمد حسین نے اپنے بیٹے کی باتیں سنیں تو فخر سے چوہدری فراغت سے کہا "چوہدری علی کی باتیں سن کر میرے کانوں میں قائد اعظم محمد علی جناح کی باتیں گونجنے لگتی ہیں۔کاش پاکستان کے حکمران اس طرح سوچیں جیسے قائد اعظم سوچتے تھے اور اس طرح معاملات چلائیں جیسے قائد اعظم چلاتے تھے۔" پھر علی سے مخاطب ہو کر بولے:

"ابھی فوری طور پر تمہارا کیا ارادہ ہے۔کیا زرینہ کو اپنے گھر نہیں لاؤ گے؟

وہاں بھی سارا گاؤں تمہارا اور زرینہ کا منتظر ہے۔ آخر وہ بھی تمہارا اور زرینہ کا استقبال کرنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ہم آئندہ سوموار دن ڈھلنے سے پہلے وہاں پہنچیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ آئندہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" اس نے بڑے چوہدری صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے فی الحال یہ جواب دیا۔ لیکن اس کا دماغ اس وقت بھی پاکستان کی بہتری کے طریقے سوچ رہا تھا۔ان سب امکانات کا جائزہ لے رہا تھا جن پر عمل پیرا ہو کر پاکستان دنیا کے ملکوں کی برادری میں نمایاں مقام حاصل کر سکتا تھا۔

فصل 22

صفدر شاہ اور سلیم موٹے کے دیہاتی طرز زندگی میں بڑھتے ہوئے شوق سے علی اور زرینہ بہت متاثر تھے۔

جب انہوں نے زرینہ سے گُھڑسواری سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی۔ انسان جہاز اڑانا سیکھ لے لیکن جب تک اسے گُھڑسواری نہ آتی ہو وہ مکمل انسان نہیں بن سکتا۔ پھر اس نے ان سے پوچھا جانتے ہو قائداعظم کو قائداعظم کس چیز نے بنایا تھا؟

پھر خود ہی کہنے لگی قائد اعظم کو قائد اعظم بنانے میں ان کے گُھڑسواری کے شوق کا بہت دخل تھا۔ گھڑسواری سے انسان میں وہ سب اوصاف پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ ایک اچھا انسان بنتا ہے۔ جب ایک انسان گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتا ہے تو سفر کے نئے امکانات کے علاوہ اس کے ذہن میں افکار کے جہان تازہ بھی کھلنے لگتے ہیں۔

علی، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر حیرت کے ساتھ زرینہ کی باتیں سن رہے تھے۔ علی نے بچپن سے گُھڑسواری سیکھی تھی۔ اظہر کو بھی کبھی کبھار گُھڑسواری کا موقع ملا تھا لیکن صفدر شاہ اور سلیم موٹا خالصتاً شہری مخلوق ہونے کی وجہ سے گُھڑسواری کے ہنر سے مکمل نابلد تھے۔

زرینہ کی باتوں سے ان کے چہروں پر حیرت کے رنگ پھیل اور سمٹ رہے تھے۔ زرینہ نے ان کی گھڑسواری سیکھنے کی خواہش دیکھتے ہوئے کہا: "جانتے ہو اچھا گھڑسوار بننے کے لیے انسان کو سب سے پہلی بات کونسی جاننی چاہیے؟"

پھر خود ہی کہنے لگی: "جو انسان گھڑسواری سیکھنا چاہے اس کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ وہ گھوڑے سے اس کی رضامندی حاصل کرنا سیکھے۔

گھوڑا اگر کسی کو اپنے سوار کے طور پر قبول کر لیتا ہے تو پھر وہ زندگی بھر کے لیے اس کا بہترین دوست بن جاتا ہے۔ وہ اپنے سوار کی زندگی کو اپنی زندگی سے زیاد قیمتی جانتا ہے اور بڑے سے بڑے خطرے سے اس کو باحفاظت نکال لے جاتا ہے۔"

علی نے زرینہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"زری جان میں بچپن سے گھڑسواری کرتا آیا ہوں لیکن میں نے کبھی نہیں سنا اور سوچا کہ سوار اور گھوڑے کے درمیان باہمی رضامندی کا کوئی معاہدہ ہوتا ہے۔"

زرینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "کیا تم نے کبھی نئے گھوڑے کو سدھایا ہے؟"

علی نے کہا:

"نہیں مجھے کبھی گھوڑے کو سدھانے کا موقع نہیں ملا۔"

"اسی لیے تم سوار اور گھوڑے کے باہمی رضامندی کے معاہدے کے بارے میں نہیں جانتے۔

لیکن تم نے کبھی پہلے سے سدھائے ہوئے گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے اس کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے کوئی بات کرنے کا تجربہ کیا ہے؟"

"وہ تو میں اکثر کرتا ہوں۔" علی نے جواب دیا۔

"اور جواب میں گھوڑا کیا کرتا ہے؟"

"وہ سر اور کان ہلا دیتا ہے۔"

"اس کا تمہاری باتوں کے جواب میں کان ہلانا اظہار رضامندی ہوتا ہے۔"

یہ ساری باتیں علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر چوہدری فراغت حسین کے ڈیرے پر بیٹھے کر رہے تھے۔

یہی باتیں کرتے زرینہ صفدر شاہ اور سلیم موٹے کو تھان پر بندھے گھوڑوں کے پاس لے گئی۔ پہلے اس

نے صفدر شاہ کو ساتھ لے کر ایک مشکی گھوڑے کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ گھوڑے نے جواب میں سر اور کان ہلائے۔ پھر اس نے صفدر شاہ سے کہا وہ اسی طرح گھوڑے کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرے اور اسے کہے کیا وہ اسے بطور سوار اپنی پشت پر بیٹھنے دے گا۔ صفدر شاہ نے زرینہ کی طرح گھوڑے کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرے تو گھوڑے نے جواب میں کان ہلا دیے۔

پھر زرینہ نے یہی چیز سلیم موٹے کو ایک دوسرے سفید گھوڑے کے ساتھ لے جا کر دہرائی۔

سفید گھوڑے نے بھی سلیم موٹے کے جواب میں کان ہلا دیے۔ اظہر اور علی پہلے سے گھڑ سواری سے آشنا تھے۔

پھر اس نے ڈیرے پر کام کرنے والے ایک ملازم سے کہا وہ تین گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈال دے۔

جب ملازم گھوڑے پر کاٹھیاں ڈال چکا تو زرینہ نے علی اور اظہر سے کہا وہ صفدر شاہ اور سلیم موٹے کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر انہیں سکھائیں کہ لگاموں اور نال کا کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود ایک الگ گھوڑے پر سوار ہو کر بولی چلیں آج صفدر اور سلیم بھائی کو گھڑ سواری کا تجربہ کرائیں۔

ساتھ ہی ملازم سے کہنے لگی کہ آج سے اگلے چند دن تک حقہ تازہ کرتے وقت اس کا پانی محفوظ رکھے۔

صفدر شاہ اور سلیم موٹے نے پوچھا کہ حقے کے پانی کا گُھڑ سواری سے کیا تعلق ہے؟

علی نے مسکراتے ہوئے کہا: "جب آج گھڑ سواری کے بعد واپس لوٹو گے اور تمہارے چوتڑوں پر لا گا لگے گا تو پھر تمہیں حقے کے پانی کی اہمیت کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔"

علی کی بات سن کر زرینہ بے اختیار ہنس دی اور پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اسے نہر کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دیا۔

علی اور اظہر بھی صفدر شاہ اور سلیم موٹے کے ساتھ زرینہ کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ آج زرینہ گھوڑے کو مناسب رفتار سے دوڑا رہی تھی۔ اُسے اندازہ تھا کہ علی اور اظہر کے ساتھ صفدر شاہ اور سلیم موٹا نو آموز تھے وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھوڑوں کو بے تحاشا دوڑایا جائے مبادا ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے اور

گھڑسواری ان کے لیے ایک خوش کن تجربے کی بجائے ایسا ناخوشگوار واقعہ بن جائے کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لیے بدک جائیں۔

وہ نہر کے کنارے کئی گھنٹے گھوڑے دوڑانے کے بعد ڈیرے پر واپس لوٹے تو سب سے زیادہ بُرا حال صفدر شاہ اور سلیم موٹے کا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی رانوں کو کسی نے کھینچ کر ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور رانوں کے اندرونی حصے کی جلد ماس سے جدا ہو رہی ہے۔

آسمان پر سورج پہلے ہی دو تہائی منزل طے کر چکا تھا۔ گھڑسواری کی وجہ سے ان کی بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔

حویلی سے ان کے لیے دوپہر کا کھانا پہلے سے آیا رکھا تھا۔ چوہدری فراغت حسین چند لوگوں کے ساتھ ان کا انتظار کر رہے تھے۔

سب نے مل کر وہیں کھانا کھایا۔ کھانے کے ساتھ اچار اور لسی نے کھانے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ زرینہ کھانا کھا کر حویلی کی طرف چل دی۔ علی، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر ڈیرے پر پڑی کھاٹوں پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔

چوہدری فراغت ڈیرے پر آئے بیٹھے لوگوں کے ساتھ حقہ گڑگڑاتے ہوئے روزمرہ کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

فصل 23

اگلے دن صبح صفدر شاہ اور سلیم موٹا سو کر اٹھے تو ان کا بُرا حال تھا۔ گزشتہ روز پہلی بار گھنٹوں گُھڑسواری کرنے کے بعد ان کی ٹانگیں اکڑی ہوئی تھیں اور ان کے لیے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

زرینہ نے ملازم کو کہہ کر حقّے میں استعمال شدہ پانی محفوظ کروا دیا تھا۔ اس نے دونوں کو ہدایت کی کہ وہ رانوں کے اوپر حقّے کا استعمال شدہ پانی ڈالیں تو کل تک ان کی ٹانگیں ٹھیک ہو جائیں گی اور آئندہ اگر وہ گُھڑسواری جاری رکھیں گے تو دوبارہ کبھی اُنہیں اس صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

صفدر شاہ اور سلیم موٹے کی اکڑی ہوئی ٹانگوں کے باعث فیصلہ کیا گیا کہ آج کہیں نہیں جایا جائے گا۔ اور سارا ٹائم حویلی پر ہی گزارا جائے گا۔ چوہدری فراغت حسین نے آج کسی کیس کے سلسلے میں کچہری جانا تھا۔ وہ صبح نہار منہ ڈرائیور کے ساتھ شہر جا چکے تھے۔ وہ گاؤں میں نہ ہوں تو پھر ان کے ملنے والے بھی حویلی یا ڈیرے کا رخ نہیں کرتے۔ اس لیے توقع یہی تھی کہ آج کا دن انتہائی سکون میں گزرے گا۔ اس لیے سب صبح بیداری کے بعد سست روی سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر بھی چمکتی دھوپ میں برآمدے کے سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

سلیم موٹے نے زرینہ سے کہا کل ہم نے گُھڑسواری کا نتیجہ تو دیکھ لیا ہے اب ہمیں اور کس مہم پر روانہ ہونا ہے؟

زرینہ نے علی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا گھڑسواری تو پہلا درس تھا ابھی تو آپ لوگوں کو اُڑتی مرغابی کو نشانہ بنانے کا ہنر سکھانا ہے۔

اُڑتی مرغابی کو نشانہ بنانے کی بات پر سب زرینہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

علی نے زرینہ سے کہا:

"زری جان گھڑسواری تک تو ٹھیک تھا لیکن اڑتی مرغابیوں کو نشانہ بنانے کی ادا کہاں سے آئی؟"

زرینہ نے شرارتی موڈ میں علی سے کہا: "چونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی وہ لڑکی ہونے کے باوجود مجھ میں وہ سب صفتیں دیکھنا چاہتے تھے جو بہادر مردوں میں ہوتی ہیں۔ میرے والد نے مجھے گُھڑسواری سکھائی، نہر میں تیرنا سکھایا، اڑتی مرغابیوں کو نشانہ بنانا سکھایا اور اگر مجھ پر کوئی حملہ آور ہو تو اپنا دفاع کرنا سکھایا۔ لیکن اس سب کے باوجود میں تم سے ایک نازک اندام لڑکی کی طرح محبت کرتی ہوں۔ اور کرتی رہوں گی۔"

"زری جان میں یہ سب کچھ سن کر بہت خوش ہوا ہوں۔ تمہیں پا کر میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں۔ کاش پاکستان کی باقی سب لڑکیاں بھی تمہاری طرح ہوں۔ اگر ہمیں پاکستان میں کوئی کردار ادا کرنے کا موقع ملا تو میں چاہوں گا کہ تم پاکستان میں کچھ ایسا اہتمام کرنا کہ سب لڑکیوں کو تمہاری طرح کے مواقع میسر آئیں۔"

" علی جان مجھے بھی یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ تم اس طرح سوچتے ہو۔ میں ڈرتی تھی کہ تمہیں میری ان صلاحیتوں کا پتہ چلا تو تمہارا رد عمل کیا ہو گا۔ لیکن آج میں سمجھتی ہوں کہ میں پاکستان کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں جسے تم جیسا صحت مند خیالات رکھنے والا اور اس طرح ٹوٹ کر محبت کرنے والا خاوند ملا ہے۔"

صفدر شاہ نے ہنستے ہوے مداخلت کی:" لیکن بھابی مجھے، سلیم موٹے اور اظہر کو تم جیسی بیویاں کہاں سے ملیں گی؟ تم صرف اپنے ماں باپ کی ہی اکلوتی اولاد نہیں شاید پاکستان کی اکلوتی لڑکی بھی ہو جسے گُھڑسواری سے لیکر نہر میں تیرنے کے علاوہ اُڑتی مرغابیوں کو نشانہ بنانے تک سب کچھ آتا ہے۔ اور اوپر سے آپ وکیل بھی ہو۔"

"صفدر بھائی آپ ٹھیک کہتے ہو۔ اگر تمہیں مجھ جیسی لڑکی چاہیے تو پھر تمہیں شاید عمر بھر کنوارا رہنا پڑے۔ جب تک ہم پاکستان میں ایسی لڑکیاں پیدا کریں گے آپ کی عمر ڈھل چکی ہو گی۔"

سلیم موٹے نے گفتگو میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا: "عمر ڈھل نہیں چکی ہو گی بلکہ حضرت دنیا سے سدھار چکے ہوں گے کیونکہ پاکستان میں شاید ہی کبھی ایسی لڑکیاں ہوں گی جن میں یہ سب گن ہوں۔"

"نہیں سلیم بھائی، ہمیں صحت مند معاشرہ بنانے کے لیے پاکستانی مردوں اور عورتوں کو ازبر کروانا ہو گا کہ وہ دونوں ایک ہی گوہر کی دو صورتیں ہیں اور دونوں برابر ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔

اللہ نے دونوں کو برابر پیدا کیا ہے۔ یہ صرف مردوں نے مذہب، قانون، اخلاق اور سماجی اقدار کی چادر اوڑھا کر عورت کو کمتر اور مرد کو برتر بنا دیا ہے۔ پھر اس میں عورتوں کا بھی قصور ہے جو مرد کو ہر چیز میں حرفِ آخر کا حق دیتی ہیں۔

حالانکہ حرفِ آخر کا معیار حق اور اصول ہونے چاہیں۔ اگر مرد حق اور اصول کی بات کرے تو وہ حرف آخر ہونی چاہیئے اور اگر عورت حق اوراصول کی بات کرئے تو وہ حرفِ آخر ہونی چاہیئے۔ محض مرد یا عورت ہونا کسی بات کو حرفِ آخر ہونے کے لیے کافی نہیں ہونا چاہیئے۔"

"لیکن زرینہ جان تم ہمیں یہ بتاؤ کہ ہم پاکستان میں یہ سب کچھ کیسے ممکن بنا سکتے ہیں؟ " علی نے زرینہ سے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں محترمہ فاطمہ جناح سے مل کر پاکستان میں ایسے پروگراموں کی بنیاد رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس سے عورتوں کی ذاتی نشوونما اور تعلیم وتربیت کی مواقع پیدا ہو سکیں تا کہ وہ پاکستانی معاشرے کی تشکیل نو میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ اگر ایک بار ہم نے پاکستان میں عورتوں کو ان کی روائتی زنجیروں سے آزاد کر دیا تو دیکھنا اس ملک میں ایسا انقلاب آئے گا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔"

"بھابی آپ کے خیالات بہت عالی ہیں لیکن محترمہ فاطمہ جناح اس ضمن میں کیا کر سکتی ہیں؟" صفدر شاہ نے کہا۔

"عورتوں کی ترقی کا ملک کی سوشل اور معاشی پالیسیوں سے تعلق ہے اور ملک پر اس وقت فوج قابض ہے۔ فوج محترمہ کی بات کیوں سنے گی؟" اظہر نے صفدر شاہ کی بات آگے بڑھائی۔

"ایوب خان کہتا ہے وہ جلدی ملک میں الیکشن کرائے گا۔ اگر ہم محترمہ کو الیکشن لڑا کر حکومت میں لے آئیں تو بات بن سکتی ہے۔" سلیم موٹے نے پھر ٹانگ اڑائی۔

اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ ایوب خان ملک میں الیکشن کرائے گا۔ اگر کرائے گا بھی تو جیسے تیسے کر کے خود الیکشن جیتے گا کسی اور کو جیتنے نہیں دے گا-" علی نے اپنی رائے دی۔

وہ سب وہیں دھوپ میں بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے کہ شہر سے چوہدری فراغت حسین واپس لوٹ آئے۔

دھوپ میں اب قدرے تمازت آنے لگی تھی اس لیے انہوں نے کرسیاں بر آمدے میں کھینچ لیں۔

چوہدری صاحب بھی ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔

وہ خاصے تھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ لگتا تھا کچہری میں معاملات ان کی مرضی سے نہیں چلے تھے جو یوں آتے ہی کرسی پر ڈھیر ہو گئے تھے۔

زرینہ نے خستہ حالی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے: "ان ججوں کو اندازہ نہیں کہ وقت کتنی قیمتی چیز ہے۔ یہ مقدمات کو جس طریقے سے نپٹاتے ہیں اس سے لوگوں کا اتنا وقت ضائع ہوتا ہے کہ اگر غلطی سے کسی کا کوئی کیس عدالت میں چل رہا ہو تو وہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

میں صبح نہار منہ اٹھ کر کچہری گیا تھا۔ دوپہر تک وہاں بیٹھا رہا۔ جب کیس کی سماعت کا وقت آیا تو جج صاحب مستقبل کی تاریخ دے کر لنچ کے لیے چلے گئے۔"

چوہدری صاحب کی بات سن کر علی نے کہا:

"یہ مسئلہ حصہ ہے اس بڑے مسئلے کا جس سے اس وقت پاکستان دوچار ہے۔ جب تک وہ مسئلہ حل نہیں ہو گا تب تک یہ مسائل اسی طرح رہیں گے بلکہ ان میں وقت کے ساتھ زیادہ شدت آتی جائے گی۔"

"زرینہ کا ماموں بھی اسی طرح سوچتا ہے اور ایسی ہی باتیں ہی کرتا ہے۔" علی کی بات سن کر چوہدری فراغت حسین نے جواب دیا۔ "لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اس کا حل کیا ہے۔ اب ایوب خان کے پاس فوج ہے، بندوقیں ہیں، ٹینک ہیں اس کا مقابلہ کون کرے گا اور کیسے کرے گا؟"

" ان سب قوتوں کو صرف آئین سے باندھا جا سکتا ہے۔ حکمران طبقات نہیں چاہتے کہ ملک میں کوئی آئین ہو۔ آئین ان پر قدغنیں لگاتا ہے۔ اور حکمران طبقات آسانی سے اس بات پر تیار نہیں ہوتے کہ ان پر قدغنیں لگیں۔" علی نے چوہدری صاحب کی بات کے جواب میں کہا۔

"علی یہ فطری بات ہے۔ طاقت طاقتور سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ خود کو مزید طاقتور بنائے۔ طاقت ور خود کو دو طریقوں سے مزید طاقت ور بناتا ہے۔ اپنی ذات میں مزید طاقت اکھٹی کر کے اور کمزور کو مزید کمزور بنا کر۔ چوہدری صاحب نے علی کی بات آگے بڑھائی۔

زرینہ نے علی اور چوہدری صاحب کے ساتھ شریک گفتگو ہونے کے لیے کہا:

"ہمیں محترمہ فاطمہ جناح سے مل کر ان سے درخواست کرنی چاہیے کہ جو کام ان کے بھائی ادھورا چھوڑ گئے ہیں وہ اپنی زندگی میں اسے پورا کر جائیں۔ اگر وہ عوام کو متحرک کر کے 1956 والا آئین ملک میں نافذ کرا دیں تو یہ ملک دوبارہ پٹڑی پر چڑھ سکتا ہے۔"

"یہ بڑی اچھی تجویز ہے۔ اگر محترمہ اس کام کے لیے اسٹینڈ لے لیں تو مشرقی اور مغربی پاکستان کی زیادہ تر سیاسی قوتیں ان کے ساتھ کھڑی ہو جائیں گی۔" علی نے زرینہ کی بات سے اتفاق کرتے ہوے کہا۔

"اگر اس طرح ملک پٹڑی پر چڑھ سکتا ہے تو میں محترمہ سے تمہاری ملاقات کا اہتمام کرتا ہوں۔ تم لوگ ان سے ملاقات کے لیے کراچی جانے کی تیاری کرو۔ چوہدری فراغت حسین نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔"

چوہدری صاحب کی بات پر سب نے بآوازِ بلند ہُرے کا نعرہ لگایا۔ اس اتفاق کے بعد چوہدری صاحب آرام کرنے کے لیے اپنی خواب گاہ کی طرف چلے گئے اور علی اور زرینہ باقی دوستوں کے ساتھ ڈیرے کی طرف پیدل روانہ ہوگئے۔

فصل 24

گاؤں سے کھیتوں کی طرف جانے والی کچی سڑک سے اتر کر جب علی، زرینہ اور ان کے دوست کھیتوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ڈیرے کے طرف رواں تھے تو وہ پگڈنڈی کی تنگی کی وجہ سے ایک ساتھ چلنے کی بجائے آگے پیچھے ایک قطار میں چل رہے تھے

سب سے آگے زرینہ تھی، اس کے پیچھے علی اور اس کے پیچھے صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر چل رہے تھے۔

کھیتوں میں ہلکے ہلکے ہوا چل رہی تھی جس سے حد نظر تک پھیلے سرسوں کے زرد پھول جھول جھول کر عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ علی، زرینہ اور اظہر کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ ان کی حسِ دید اس منظر کا بچپن سے مشاہدہ کرتی آئی تھی اس لیے وہ سیدھے چلے جا رہے تھے لیکن صفدر شاہ اور سلیم موٹے نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ دونوں اس منظر کے حسن سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

خاص طور پر سلیم موٹے کی تخلیقی صلاحیتیں اٹھلا رہی تھیں۔ اچانک اس نے چلتے چلتے بلند آواز سے گانا شروع کر دیا:

اے نیلگوں آسماں

اے مہرباں

آسماں

اے خورشیدِ تاباں

اے مہرباں

خورشیدِ تاباں

یونہی لہلہاتا رہے

یہ سنہرا ہریالا پن

تا قیامت

رہے سلامت

یہ وطن

سلیم موٹے کا والہانہ پن دیکھ کر زرینہ، علی، صفدر شاہ اور اظہر بھی اس کے ہم صدا ہو گئے۔

اے نیلگوں آسماں

اے مہرباں

آسماں

تیری پاکیزگی

ہو اس وطن کے

ساکنوں کی

پیشانیوں سے عیاں

اے خورشیدِ تاباں

اے مہرباں

خورشیدِ تاباں

تیرے پرتو سے

چمکتا رہے

اس دیس کے

ساکنوں کا جہاں

اے نیلگوں آسماں

اے مہرباں

آسماں

کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتے، یہی گیت گاتے وہ سب ڈیرے پر پہنچے تو وہاں میئر شہر خواجہ احسن اپنے کلرک نور حسین کے ساتھ علی اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

میئر شہر کو ڈیرے پر دیکھ کر سب حیران ہوئے کہ وہ وہاں پر کیا کر رہے ہیں؟

ان کو حیران دیکھ کر میئر نے کہا کہ وہ چوہدری فراغت حسین کی حویلی کی طرف جا رہے تھے کہ نور حسین نے اُنہیں کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتے ڈیرے کی طرف آتے دیکھا تو وہ حویلی جانے کی بجائے اِدھر چلے آئے۔

"خواجہ صاحب آپ کو اپنے ڈیرے پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ خوش آمدید۔" زرینہ نے میئرِ شہر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے چوہدری صاحب سے ملے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ آخری بار وہ اس وقت شہر آئے تھے جب تم نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ تب تمہارے ماموں چوہدری فیض کے گھر پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔" خواجہ صاحب نے زرینہ کے جواب میں کہا۔

" وہ شہر کم ہی جاتے ہیں۔ کبھی کبھار کچہری جاتے ہیں۔ کچہری کے کام انہیں اکثر تھکا دیتے ہیں اور پھر وہ جلد واپس واپس لوٹ آتے ہیں۔" زرینہ نے جواب دیا۔

علی نے زرینہ اور میئر کی بات میں مداخلت کرتے ہوئے کہا:

" آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ یہاں آنا کیسے ہوا۔ کیا محض چوہدری صاحب سے ملاقات کا ارادہ تھا کہ کوئی اور مقصد تھا؟"

"نہیں علی ہم اصل میں یہاں تمہارا تعاقب کرتے ہوئے پہنچے ہیں۔ پہلے نور حسین تمہارے گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ تم ابھی تک یہاں ہو تو ہم یہاں چلے آئے۔"

خواجہ صاحب نے وضاحت کی۔

"سب خیریت تو ہے۔ آپ کو میرا تعاقب کرنا پڑ رہا ہے ؟"

"ہاں سب۔ خیریت ہے۔ پرسوں کرنل آیا تھا۔ کہہ رہا تھا تمہاری جی ایچ کیو طلبی ہوئی ہے۔ جنرل ایوب تمہیں ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ملاقات جی ایچ کیو کی بجائے جنرل صاحب کے ریحانہ میں واقع آبائی گھر پر ہو گی۔"

میئرِ شہر نے وہاں آنے کی مزید وضاحت پیش کی۔

" جنرل صاحب سے ملاقات کے بارے میں سوچنا پڑے گا کہ آیا یہ کرنی بھی چاہیے یا نہیں۔" علی نے میئرِ شہر کو جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ علی تمہارے پاس سوچنے کا وقت نہیں۔ کل صبح یہاں ہیلی کاپٹر پہنچے گا۔ اور تمہیں جنرل صاحب سے ملاقات کے لیے ریحانہ لے جائے گا۔" میئر صاحب نے مسکراتے ہوئے علی کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔

" چلیں کل کی کل دیکھیں گے۔ فی الحال حویلی چلتے ہیں۔ شام ڈھل رہی ہے۔ وہاں ڈنر کریں گے اور وہاں میئر صاحب کی چوہدری صاحب سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ میئر صاحب کو اپنے ہاں دیکھ کر خوش ہوں گے۔" زرینہ نے مشورہ دیا۔

" ہاں یہ اچھا خیال ہے۔ ہم جلد فارغ ہو کر شہر واپس جانے والے بنیں گے۔"

میئر نے زرینہ کے مشورے پر رائے دی۔

میئر کو ڈیرے پر دیکھتے ہی زرینہ نے ملازم کے ذریعے حویلی پر چوہدری صاحب کو میئرِ شہر کے آنے کی اطلاع بھجوا دی تھی۔ وہ جب حویلی پر پہنچے تو چوہدری صاحب پہلے سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

اُنہوں نے میئر کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ اور پھر سب جا کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

میئر شہر نے مختصراً وہاں آنے کا مقصد بیان کیا تو چوہدری صاحب ان کی بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ اس وقت ایوب خان بلا شرکت غیرے پاکستان کا حکمران تھا۔ ہر چیز اس کے کنٹرول میں تھی۔ علی نے چوہدری صاحب کو گومگو کا شکار دیکھا تو اس نے میئر سے کہا کہ ٹھیک ہے وہ کل جنرل ایوب سے ملنے ریحانہ جائے گا۔ زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ اس نے میئر سے مزید کہا کہ وہ کرنل کو بتا دیں اور اسے کہیں وہ کل لیٹ مارننگ ہیلی کاپٹر بھجوا دیں۔ زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر نے علی کے فیصلے کی تائید کی۔

ان کی رضامندی سے میئر اور چوہدری صاحب کچھ آسودہ خاطر ہوئے۔ انہی باتوں میں ٹیبل پر کھانا چن دیا گیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ زرینہ نے کھانے کے دوران سب کو سلیم موٹے کے کھیتوں میں تخلیق کردہ گیت کے بارے میں بتایا تو میئر اور چوہدری صاحب نے بیک زبان کہا کہ وہ بھی وہ گیت سننا پسند کریں گے۔

میئرِ شہر اور چوہدری صاحب کی خواہش کے احترام میں علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ سلیم موٹے نے گانا شروع کیا:

اے نیلگوں آسماں

اے مہرباں

آسماں

اے خورشیدِ تاباں

اے مہرباں

خورشیدِ تاباں

یونہی لہلہاتا رہے

یہ سنہرا ہریالا پن

تا قیامت

رہے سلامت

یہ وطن

سلیم موٹے کے ساتھ علی، زرینہ، صفدر شاہ، اور اظہر بھی ہم صدا ہوے تو کھانے کے ٹیبل پر بیٹھے اور لوگ بھی ان کے ساتھ گانے میں شامل ہو گئے۔

اے نیلگوں آسماں

اے مہرباں

آسماں

فصل 25

اگلے دن صبح ناشتے کی ٹیبل پر علی نے زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹے، اظہر اور چوہدری صاحب سے جنرل ایوب خان سے اپنی متوقع ملاقات کے بارے مشورہ چاہا۔

چوہدری صاحب رات میئر کی وجہ سے خاموش تھے۔ وہ اس کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ کر چانس نہیں لینا چاہتے تھے کہ مبادا قبل از وقت ان کا نقطہ نظر کرنل کو معلوم ہو۔

کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ کرنل سونے سے پہلے میئر سے علی کی ملاقات کی تفصیل ضرور معلوم کرے گا۔

وہ چاہتے تھے کہ پہلے وہ آپس میں مشورہ کر لیں تو پھر اپنا عندیہ دیں کہ علی جنرل ایوب سے ملنے جائے گا یا نہیں۔ لیکن چونکہ علی نے پہلے ہی گزشتہ رات میئر سے حامی بھر لی تھی کہ وہ جنرل ایوب سے ملنے جائے گا۔ اس لیے اب فوکس اس بات پر تھا کہ جنرل ایوب کی کس بات کا کیا جواب دیا جائے۔ چوہدری صاحب کا مشورہ تھا کہ اگر ایوب خان وزارت وغیرہ کی پیشکش کرے تو اُسے قبول کر لیا جائے۔

قومی سطح پر شناخت کے لیے اگر علی چند سال ایوب خان کے سیاسی سیٹ اپ کا حصہ بن جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

زرینہ کا خیال چوہدری صاحب کے خیال کے بالکل برعکس تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سور جتنا مرضی سرخی پاوڈر اپنے چہرے پر تھوپ لے وہ سور ہی رہتا ہے۔ اس کے ساتھ شامل ہو کر کوئی شخص نیک نامی نہیں کما سکتا۔

اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اصل پاور تو جنرل ایوب کے پاس ہے۔ علی اگر اس کے ساتھ شامل ہو گا تو بھی وہ اپنے آئیڈیلز کے مطابق کام نہیں کر سکے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ اگر ایوب خان ایس کوئی پیشکش کرے تو اُسے شکریے کے ساتھ رد کر دیا جائے۔

صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر بھی زرینہ کے خیال کے حامی تھے۔ ان سب کی بات سن کر علی نے بھی زرینہ کے خیال کی تائید کی اور کہا کہ وہ جنرل ایوب خان کے کسی سیٹ اپ کا حصہ نہیں بنے گا۔ بلکہ جس پلان پر وہ چل رہے ہیں اسی پر چلتے رہیں گے۔ پھر اس نے زرینہ سے کہا:

"زری جان آپ بھی تو میرے ساتھ ہوں گی -اور مجھے صحیح فیصلے پر پہنچنے میں مدد دیں گی۔"

"ہاں علی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ بلکہ ہو سکا تو جنرل کو بھی کچھ اچھے مشورے دے کر وہاں سے اٹھوں گی۔"

" لیکن زری جان جنرل سے ملاقات کے دوران کسی اڑتی مرغابی کو نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ آرمی والے ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔"

علی نے زرینہ کو تنگ کرنے کے انداز میں مشورہ دیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو علی۔ جہاں دلیل کی بجائے فیصلہ بندوق کرے اور وہ بھی ایک باوردی جنرل کی تو وہاں عقل و فکر کی بات کرنا ہنر نہیں عیب بن جاتا ہے۔"

انہی باتوں میں دھوپ دیواروں سے نیچے اترنا شروع ہوئی تو وہ سب جلدی سے تیار ہو گئے۔

علی انگریزی سوٹ میں بالکل انگلستان کا گورا دکھائی دے رہا تھا۔ زرینہ ساٹن کی سفید شلوار قمیض میں ایرانی دلہن دکھتی تھی۔ صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر بھی انگریزی سوٹوں میں ملبوس تھے۔

ان کی تیاری مکمل ہوئی ہی تھی کہ حویلی کے اوپر ہیلی کاپٹر دکھائی دیا جو کہ چند لمحوں میں حویلی کے ساتھ کھلے گارڈن میں لینڈ ہوا۔ علی، زرینہ اور اس کے دوست ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچے تو فوجی وردی میں ملبوس دو چاق و چوبند نوجوانوں نے اُنہیں سلیوٹ کیا اور پھر ہیلی کاپٹر پر سوار ہونے میں اُنہیں مدد دی۔

چند لمحوں میں ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہو کر راولپنڈی کی طرف روانہ ہوا۔ علی اور زرینہ اس سے پہلے جہاز میں سفر کر چکے تھے لیکن ہیلی کاپٹر میں یہ ان کی پہلی پرواز تھی۔

ہوائی جہاز سے زمین کے مناظر سوائے ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت زیادہ واضح طور پر دکھائی نہیں دیتے لیکن ہیلی کاپٹر سے زمین کے مناظر بہت وضاحت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا، اور اظہر مسلسل ہیلی کاپٹر سے نیچے دیکھ رہے تھے۔ دور دور تک پھیلے کھیت، درخت اور گاؤں اُنہیں بہت اچھے لگ رہے تھے۔

ہیلی کاپٹر جب راولپنڈی کے قریب پہنچا تو پائلٹ نے اس کا رخ مارگلہ ہلز کی طرف موڑ دیا۔ پھر کہنے لگا:

"ہمیں ان پہاڑیوں کے پیچھے جانا ہے۔ وہیں ہے ایوب خان صاحب کا گاؤں۔ ان کے ابائی گھر میں اب کوئی نہیں رہتا۔ صرف چند ملازم ہیں جو ایوب خان اور ان کے خاندان کی کبھی کبھار یہاں ذاتی وجوہات کی بنا پر آمد کے موقع پر ان کی خدمت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ صدر صاحب بعض اوقات اپنی ذاتی قسم کی ملاقاتوں کے لیے بھی اپنا یہ آبائی گھر استعمال کرتے ہیں۔

ان ملازموں کے علاوہ چند فوجیوں پر مبنی حفاظتی دستہ ہے جو خان صاحب کی آمد پر مستعد ہو جاتا ہے ورنہ وہ ہمہ وقت اپنے خیموں میں پڑے رہتے ہیں۔

چند دن گئے خان صاحب نے یہاں امیر محمد خان آف کالا باغ سے بھی ملاقات کی تھی۔ ہم لوگ ہی انہیں اسی ہیلی کاپٹر پر ان کی کالا باغ اسٹیٹ سے لائے تھے۔"

پائلٹ علی کو خود ہی یہ ساری باتیں بتا رہا تھا۔ "کیا مونچھیں تھیں نواب صاحب کی۔ پائلٹ نے ہنستے ہوئے نواب امیر محمد خان کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔"

انہی باتوں میں ہیلی کاپٹر زمین پر بنائے گئے ایک ہیلی پیڈ پر اترا تو بیس کے قریب باوردی فوجیوں نے اگے بڑھ کر ہیلی کاپٹر کو گھیرے میں لے لیا۔

پائلٹ نے نیچے اتر کر ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھولا اور علی اور اس کے دوست باہر آئے تو چاق و چوبند باوردی فوجیوں نے تنے ہوئے بازووں کے ساتھ اُنہیں سلیوٹ کیا۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر اُنہیں اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ یہ سادگی کے ساتھ بنا ہوا ایک چھوٹا سا گھر تھا جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے حال میں اپ لفٹ کیا گیا ہے۔

فوجی گائیڈ نے انہیں لے جا کر ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایوب خان کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔

نکلتے ہوئے قد و قامت کا مالک، شکل وصورت سے کاٹھا پٹھان اور بات چیت میں ایبٹ آبادی پنجابی بولنے والا ایوب خان علی اور زرینہ کو اس ایوب خان سے مختلف دکھائی دیا جس کی تصویریں پاکستانی اخبارات میں زیادہ تر فوجی وردی اور کبھی کبھار انگریزی سوٹ پہنے ہوئے چھپتی تھیں۔

علی اور زرینہ اور ان کے دوست ایوب خان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایوب خان نے سب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور انہیں اپنے آبائی گھر میں خوش آمدید کہا۔

زرینہ کے ساتھ ہاتھ ملاتے وقت ایوب خان صاحب نے کہا کہ وہ اس لباس میں انتہائی خوبصورت دکھائی دے رہی ہے۔

زرینہ نے جواباً پُر اعتماد آواز میں براہِ راست ایوب خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ لباس اس کی وجہ سے اُنہیں خوبصورت دکھائی دے رہا ہے۔

زرینہ کے پُر اعتماد جواب پر ایوب خان نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ یکے بعد دیگرے علی اور اس کے دوستوں کی طرف بڑھا دیا۔ اور پھر کمرے میں پڑے اکلوتے صوفے پر بیٹھ گئے۔ علی اور زرینہ ان کے ساتھ اگلے صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ صفدر شاہ، سلیم موٹا، اور اظہر دوسری طرف پڑے بڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔

ایوب خان نے علی کو یہاں دعوت دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ مغربی پاکستان کی گورنر شپ کے لیے مختلف شخصیات کے ناموں پر غور کر رہے ہیں۔ اور علی کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ پھر کہنے لگے یہ فہرست مختصر ہو کر دو ناموں تک محدود ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک نام علی حسین کا ہے

اور دوسرا نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کا۔ انہوں نے کہا کہ وہ امیر محمد خان سے پہلے ہی مل چکے ہیں اور خاصی حد تک مطمئن ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ مغربی پاکستان کا گورنر سنٹرل پنجاب سے ہو اور سنٹرل پنجاب میں اُنہیں چوہدری محمد حسین کے خاندان کے علاوہ کوئی اتنا با اثر خاندان نظر نہیں آتا جس کی شہرت ہر قسم کے داغ دھبے سے پاک ہو۔ پھر چوہدری محمد حسین کے خاندان کی پاکستان کی تخلیق میں خدمات اتنی زیادہ ہیں اور وہ بھی کسی قسم کی سیاست میں ملوث ہوئے بغیر-اس لیے چوہدری محمد حسین کا خاندان پاکستان کی تعمیر و ترقی میں وہ کردار ادا کر سکتا ہے جس کے لیے افواجِ پاکستان کو مجبوراً پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہونا پڑا ہے۔

علی، زرینہ اور ان کے دوستوں نے جنرل ایوب خان کی بات پوری توجہ سے سنی۔ علی نے ایوب خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے چوہدری محمد حسین کے خاندان کو اور اس خاندان کا چشم و چراغ ہونے کے حوالے سے اسے اس قابل سمجھا ہے کہ وہ اس کے نام پر مغربی پاکستان کی گورنر شپ کے لیے غور کر رہے ہیں۔ اس ابتدائیے کے بعد علی نے کہا اس سے پہلے کہ وہ گورنر شپ کے حوالے سے کچھ کہے لازم ہے کہ جنرل صاحب کچھ بنیادی باتوں کی اس کے اور اس کے دوستوں کے لیے وضاحت کر دیں۔ اس نے کہا ان کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جنرل صاحب انہیں بتائیں کہ وہ پاکستان میں ملٹری رول کے ذریعے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ کونسے مقاصد ہیں اور کونسے اہداف ہیں جن کے حصول کے لیے علی حسین کو بطور گورنر خدمات سر انجام دینا ہوں گی۔ ایوب خان نے انتہائی تحمل کے ساتھ علی کے سوالات سنے اور پھر کہنے لگے:

"وہ اور افواج پاکستان چاہتی ہیں کہ پاکستان کو ایک نا قابل تسخیر قلعے میں تبدیل کر دیا جائے۔ ہندوستان کی نیت پاکستان کے بارے میں نیک دکھائی نہیں دیتی۔ اُنہوں نے پاکستان بنتے ہی کشمیر کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ بد قسمتی سے گزشتہ چودہ پندرہ سال کا پاکستانی سیاست دانوں کا ریکارڈ اتنا خراب ہے کہ ان کی

موجودگی میں پاکستان کو ناقابل تسخیر قلعہ بنانے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس پر ان کی کرپشن پاکستان کی جڑیں کھوکھلا کر رہی تھی۔ جس کی وجہ سے فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔

ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ چالیس پچاس سالوں تک افواج پاکستان اپنی نگرانی میں آپ جیسے محب وطن، باکرداراور اصول پسند لوگوں کی مدد سے پاکستان کو فوجی اور اقتصادی طور پر اتنا مضبوط کر دیں کہ ہندوستان پاکستان کی طرف کبھی بری نیت سے نہ دیکھ سکے۔

بطور گورنر میری تم سے یہ توقعات ہوں گی کہ تم مغربی پاکستان کے اندر لا اینڈ آرڈر قائم رکھو۔ اقتصادی ترقی کی لیے زمین داروں اور تجارتی طبقے کو اس طرح اپنے کام سے کام رکھنے پر فوکس رکھو کہ وہ زمین داری اور کاروبار کے علاوہ کسی اور چیز پر توجہ نہ دیں۔ مارکیٹ میں بنیادی ضرورت کی اشیا کی کمی نہ آنے پائے۔ اور صوبے میں مجموعی طور پر امن اور ڈسپلن قائم رہے۔"

علی نے ایوب خان کا جواب سنا تو کہنے لگا: "جنرل صاحب آپ نے جن اغراض و مقاصد کے حصول کی بات کی ہے بلاشبہ ہر سچے پاکستانی کا نہ صرف ان اغراض و مقاصد سے اتفاق ہونا چاہیے بلکہ اسے پوری کوشش کرنی چاہیے کہ یہ اغراض و مقاصد اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہونے پائیں۔ لیکن معاشرتی عمل میں ایسا ہوتا نہیں۔ ہر فرد کا ذہن افکار و نظریات کا ایسا کارخانہ ہے جس کا پاور ہاوس اس کی پیدائش کے وقت آن ہوتا ہے اور اس کی موت کے وقت آف ہوتا ہے۔ وہ پیدائش اور موت کے درمیانی عرصہ میں مسلسل سوچتا رہتا ہے، نئے خیالات کی تشکیل کرتا ہے۔ نئے خیالات عمل کے نئے سلسلوں کو جنم دیتے ہیں جو معاشروں میں تبدیلی کی وجہ بنتے ہیں۔ اس سلسلے کو نہ کوئی لا اینڈ آرڈر روک سکتا ہے نہ کوئی ڈسپلن۔ یہ کارخانہ اتنا طاقت ور ہے کہ انسان بظاہر سو بھی جائے تو بھی یہ مصروفِ عمل رہتا ہے اور اچھے بُرے خواب تخلیق کرتا رہتا ہے۔"

علی کی باتیں سن کر جنرل ایوب خان نے مسکراتے ہوئے سر کو جھٹکا دیا اور کہنے لگے: "علی میں توقع نہیں کر رہا تھا کہ تم مجھے سماجیات کے ان بکھیڑوں میں ڈالو گے ۔ لیکن تمہاری باتیں دلچسپ ہیں۔ اور مجھے تمہارے خیالات جان کر خوشی ہوئی ہے۔"

زرینہ اور علی کے دوستوں نے واضح طور پر جنرل ایوب خان کے سر کے جھٹکے کا نوٹس لیا۔ اور دل ہی دل میں علی پر داد کے ڈونگرے برسا دیئے۔ زرینہ نے محبت بھری نظروں سے علی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں ایوب خان کے چھکے چھڑانے پر اسے داد دی۔

اتنی بات کے بعد نہ علی کو ضرورت رہی کہ وہ ایوب خان کی گورنرشپ کی پیشکش ٹھکرائے اور نہ جنرل ایوب خان کو ضرورت رہی کہ وہ علی سے کہہ دیں کہ وہ نہیں نواب آف کالا باغ امیر محمد خان مغربی پاکستان کی گورنرشپ کے لیے زیادہ موزوں شخص ہے۔

ملاقات کے باقاعدہ اختتام سے پہلے ایوب خان نے علی کے دوستوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تو ان کی نظریں اظہر پر آکر رک گئیں۔ انہوں نے اظہر کو بغور دیکھا اور پھر اسے پوچھا کیا اس کا فوج کے ساتھ تعلق ہے۔

اظہر نے کہا اس کے والد فوج میں تھے اور اس کا بڑا بھائی فوج میں ہے لیکن وہ فی الحال زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اپنا زیادہ تر وقت علی کے ساتھ گزارتا ہے۔

ایوب خان نے کہا: "کیا تم پنجاب رجمنٹ والے میجر ناصر کے بیٹے ہو جن کا کئی سال قبل انتقال ہو گیا تھا۔ تمہاری شکل میں مجھے میجر ناصر کی شکل دکھائی دیتی ہے۔ میجر ناصر نے میرے ساتھ مشرقی پاکستان میں میری کمان میں کام کیا تھا۔ تم ہو بہو ان کی کاپی ہو۔ تمہارا بڑا بھائی امتیاز بھی اب آرمی میں میجر ہے۔ اور پنجاب آرٹلری کے ساتھ اس وقت جہلم میں پوسٹ ہے۔ لیکن تم نے آرمی کیوں جائن نہیں کی؟"

"بڑے بھائی کا کہنا تھا کہ میں خاندانی معاملات اور زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر رہوں۔" اظہر نے ادب کے ساتھ جنرل ایوب کو جواب دیا۔

"ویل ینگ مین۔ تم سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تشریف آوری کا شکریہ۔"
اس کے ساتھ ہی وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر چلے گئے اور فوجی گائیڈ نے آگے بڑھ کر علی اور اس کے گروپ کی ہیلی کاپٹر تک راہنمائی کی۔ وہ سب واپس جانے کے لیے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ چکے تو اس فوجی نے انہیں سلیوٹ کیا اور ساتھ ہی ہیلی کاپٹر انہیں واپس گاؤں لے جانے کے لیے ہوا میں بلند ہو گیا۔

فصل 26

علی کی اپنے گاؤں واپسی مختلف وجوہات کی بنا پر التوا کا شکار ہوتی چلی آ رہی تھی لیکن اب وہ چاہتا تھا کہ گاؤں واپس جائے۔ اپنے لوگوں سے ملے۔ اس مٹی کی خوشبو محسوس کرے جو ہمیشہ اس کے دل اور روح میں رچی بسی رہتی تھی۔

پھر اس نے بڑے چوہدری صاحب سے وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ وہ آئندہ سوموار دن ڈھلے گاؤں پہنچے گا۔ چنانچہ وعدے کے مطابق، اگلے سوموار وہ زرینہ اور دوستوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر کھیتوں کھلیانوں اور پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے گاؤں پہنچا تو سورج آخری کرنیں بکھیر تا مغربی افق پر تیزی سے روپوش ہو رہا تھا۔

گاؤں کے سب لوگ اس دن علی اور اس کے دوستوں کا استقبال کرنے کے لیے شام ڈھلنے سے بہت پہلے گاؤں کے باہر ان کے منتظر تھے۔ جیسے ہی انہیں دور افق پر گھوڑوں سے اٹھتا گرد و غبار دکھائی دیا ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا۔

چند لمحوں میں جب علی، زرینہ اور ان کے دوست گھوڑے دوڑاتے ان کے پاس پہنچے ان کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔

بڑے، بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں سب علی پر صدقے واری جا رہے تھے۔ زرینہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے اور زرینہ کے لیے لوگوں کا جوش و جذبہ دیکھ کر علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ مٹی کا تعلق بھی کیسا تعلق ہے۔ جو کبھی مٹائے نہیں مٹتا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسان دنیا میں کہیں بھی چلا جائے وہ اپنی مٹی کے ساتھ ہمیشہ بندھا رہتا ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے وہ چاہتا ہے کہ واپس اس مٹی کی طرف لوٹ جائے جس نے اُسے جنم دیا تھا۔ یہاں تک کہ ماں باپ

اور آباو اجداد کی قبریں بھی اُس کے لیے ایسی پناہ گاہیں بن جاتی ہیں جہاں جا کر اس کے اختیار کے سب بند ٹوٹ جاتے ہیں اور ماضی اور مستقبل اس طرح زمانہ حال میں شامل ہو جاتے ہیں کہ نہ ماضی ماضی رہتا اور نہ مستقبل مستقبل۔ صرف ایک دل درد مند ہوتا ہے یا آنکھوں سے امڈتے ہوئے آنسو۔

علی نے اپنے آنسوں کو آنکھوں میں اس طرح چھپالیا کہ کسی کو اس کے جذبات کی خبر تک نہ ہونے پائی۔

علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر نے اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں ملازموں کو تھما دیں اور خود گاؤں کے لوگوں کے ساتھ علی کی حویلی کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔

سب چلتے چلتے حویلی پہنچے تو وہاں جشن کا سماں تھا۔ ساری حویلی کو اس طرح بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا تھا کہ ان کی روشنی سے حویلی کے ارد گرد کی ساری فضا منور ہو رہی تھی۔

علی زرینہ اور ان کے دوست جب حویلی میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر ان کو حیرت ہوئی کہ وہاں ان کا استقبال کرنے کے لیے شہر سے ان کے سب جاننے والے آئے بیٹھے تھے۔

چوہدری فیض، اُن کی بیگم اور بچے۔ میئر شہر، ان کی بیگم اور بچے۔ کالج کے بیشتر اساتذہ اور طالب علم سب وہاں آئے بیٹھے تھے۔ ان کے علاوہ پاکستان کی کئی نامی گرامی شخصیات وہاں موجود تھیں۔ حویلی سے ملحقہ گارڈن میں بینڈ شادی کی دُھنیں بجا رہا تھا اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی گفتگو اور سوشل سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ علی اور زرینہ کو حویلی میں داخل ہوتے دیکھ کر ہر طرف سے مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ علی اور زرینہ کو محسوس ہوا کہ ان کی شادی کی کچھ رسمیں باقی رہ گئی تھیں جنہیں اب پورا کیا جا رہا تھا۔

چنانچہ انہوں نے بھی جلدی سے دوبارہ دلہا دلہن کا لباس پہنا اور گارڈن میں جا کر آنے والوں میں گھل مل گئے۔

وہاں تقریباً سب لوگوں کو علی اور زرینہ کی جنرل ایوب خان سے ملاقات کا علم تھا۔ سب جاننا چاہتے تھے کے جنرل ایوب خان نے علی کو کیوں بلایا تھا۔ اور علی اور ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی۔ علی نے

دلہا دلہن کے لیے بنائے گئے اسٹیج پر کھڑے ہو کر وہاں آنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں جنرل ایوب خان سے اپنی ملاقات کا احوال سنایا۔ وہاں پر موجود تقریباً سبھی لوگوں نے علی کے فیصلے کی تحسین کی کہ اس نے جنرل ایوب کی مغربی پاکستان کا گورنر بننے کی پیشکش ٹھکرا دی۔ جب وہ لوگوں کو جنرل ایوب خان سے ملاقات کے بارے میں بتا رہا تھا زرینہ اس کے ساتھ کھڑی محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ جب علی لوگوں کو ملاقات کی تفصیل بتا چکا تو زرینہ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ علی نے اُنہیں جنرل ایوب خان سے ملاقات کی تفاصیل تو بتا دی ہیں لیکن وہ بات نہیں بتائی جس پر ایوب خان کے سر کو جھٹکا لگا تھا۔ اور وہ علی سے مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ پھر اس نے لوگوں کو علی کی جنرل ایوب سے کہی گئی وہ بات سنائی جس میں علی نے ایوب خان کو بتایا تھا کہ کس طرح انسانوں کے ذہن ان کے سونے کے بعد بھی خواب دیکھتے رہتے ہیں اور کیسے انہیں بندوقوں سے کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ زرینہ نے جس طرح یہ بات لوگوں کو سنائی اور جس طرح اس نے جنرل ایوب خان کے سر کے جھٹکے کا ذکر کیا سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ چوہدری فیض نے علی کے جنرل ایوب خان کے ساتھ مکالمے پر اسے داد دیتے ہوئے کہا کہ اس نے بہت خوبصورتی کے ساتھ جنرل ایوب کے نظام کا حصہ بننے سے خود کو بچا لیا۔

میئر نے علی کی گفتگو سن کر اطمینان کی سانس لی کہ کم از کم اب کرنل اُن سے مطالبہ نہیں کرے گا کہ وہ علی اور اس کے دوستوں کے معاملات میں مداخلت کریں۔

علی اور زرینہ کی باتیں ختم ہوئیں تو بڑے چوہدری صاحب علی کی جگہ پر کھڑے ہوئے اور وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"آج کا دن میری اور میرے خاندان کی زندگیوں کا اہم ترین دن ہے۔ آج میرا اکلوتا بیٹا نہ صرف شہر سے تعلیم مکمل کر کے لوٹا ہے بلکہ اس کی بیوی زرینہ بھی اس کے ساتھ ہے۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں زرینہ چوہدری فراغت حسین صاحب کی اکلوتی اولاد ہے۔ میں اور چوہدری فراغت حسین چاہتے تھے کہ علی اور زرینہ کی شادی ہو جائے۔ لیکن دونوں جدید تعلیم سے آراستہ ہونے کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وہ تب تک شادی نہیں کریں گے جب تک ایک دوسرے سے مل نہ لیں۔

پھر اتفاقاً ایسا ہوا کہ اللہ تعالی نے مدد کی اور میری اور چوہدری فراغت حسین کی مراد اس طرح پوری ہوئی کہ ہم چاہتے بھی تو شاید اتنی خوبصورتی کے ساتھ معاملات کو ترتیب نہ دے پاتے۔

پھر جس انداز میں ان کی شادی کے انتظامات ہوئے اس کے لیے بھی میں اپنے دوست اور زرینہ کے ماموں چوہدری فیض کا بہت ممنون ہوں۔ ہمارے معاشرے میں شاید ہی علی اور زرینہ کی شادی کی کوئی اور مثال ہو۔ نہ کوئی رشتہ مانگنے گیا۔ نہ کسی نے شادی کی تاریخ کا تعین کیا۔ نہ لڑکے اور لڑکی کو پتہ تھا کہ ان کے مختصر معاشقے کے بعد اتنی جلدی شادی کا مرحلہ آ جائے گا۔ ان کی شادی جتنا بڑا سرپرائز ان کے لیے تھی باقی سب لوگوں کے لیے بھی اتنا ہی بڑا سرپرائز تھی۔

اس شادی کی سب سے خوبصورت بات یہ تھی کہ سب اس شادی سے خوش تھے۔ لڑکا، لڑکی، ان کے والدین۔ ان کے دوست اور ملک کی سب اہم شخصیات۔ سب اس شادی سے خوش تھے اور سب نے انتہائی مختصر نوٹس کے باوجود پورے جوش و جذبہ کے ساتھ اس شادی میں شمولیت کی تھی۔ یہاں تک کہ اس ملک کی محترم ترین ہستی، ہمارے عظیم قائد، قائداعظم محمد علی جناح کی محبوب ترین ہمشیرہ بھی شادی میں شامل ہوئیں اور علی اور زرینہ کو اپنی نیک خواہشات کا نذرانہ پیش کیا۔

آج جب علی اپنی دلہن زرینہ بیگم کے ساتھ گھر واپس لوٹا ہے مجھے اپنی خوشی کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔

میں ان دونوں کو خوش آمدید کہتا ہوں اور اس اہم موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ سب کی موجودگی میں یہ اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ آج سے میں نے زمینداری کے معاملات سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کیا

ہے۔ آج کے بعد علی زمینداری کے معاملات میں مختار کل ہے۔ وہ جیسے جس طرح ان معاملات کو چلانا چاہے چلائے۔
میری زندگی کے آخری لمحے تک اُسے میرے مشورے ضرور حاصل رہیں گے لیکن سارے روزمرہ کے معاملات اسی کی ذمہ داری ہوں گے۔ اور اسی کے فیصلوں کو اوّلیت حاصل ہو گی۔
اس ضمن میں میں نے چوہدری فیض صاحب کو کہہ دیا ہے کہ وہ قانونی پہلوؤں کی تکمیل جلد از جلد کر دیں تاکہ علی کی آبائی امانت اسے منتقل ہو جائے۔"
بڑے چوہدری صاحب کے اعلان کو سب لوگوں نے سراہا۔ انہوں نے بڑے چوہدری صاحب اور علی دونوں کو مبارک باد دی۔
ابھی بڑے چوہدری صاحب کے اعلان کے بعد علی اور زرینہ گاؤں والوں اور باہر سے آنے والے مہمانوں کی مبارک باد وصول کر رہے تھے کہ چوہدری فراغت حسین بھی ان کے ساتھ آ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔
"ابھی ابھی بڑے چوہدری صاحب نے جو اعلان کیا ہے میں اس پر اُنہیں اور علی اور زرینہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بھی کچھ اہم اعلانات کرنا چاہتا ہوں۔ میری عمر بھی بڑے چوہدری صاحب جتنی ہے اور جسمانی حالت بھی ان سے ملتی جلتی ہے۔ جس طرح علی بڑے چوہدری صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے۔ زرینہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ چونکہ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا میں نے اسے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ اسے ہر اس فن کی علاقے کے بہترین اہل فنون سے تربیت دلائی ہے جو ہر شجاع نوجوان کی شخصیت کا حصہ ہونا چاہیے۔
اسے نوعمری سے نہر میں تیرنا سکھایا۔ اسے بندوق سے نشانہ بازی کی تربیت دلائی کہ اگر زندگی میں کبھی اُسے اپنے دشمنوں کے خلاف کھڑا ہونا پڑے تو اسے کمزوری کا احساس نہ ہو۔ اُسے گھڑسواری کی اعلیٰ

تربیت دلائی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے لاَ میں ڈگری لی جس سے وہ اس ملک کے آئینی اور قانونی پیچیدگیوں سے ویسے ہی شناسا ہے جیسے کوئی اہم قانون دان۔

اس سب کے باوجود وہ ایک مثالی بیٹی ہے۔ جو کومل کی طرح نرم و نازک ہے اور ہمارے دلوں کو اپنی محبت اور نرم خوئی سے ہمیشہ راحت فراہم کرتی ہے۔

میں اللہ تعالی کا مشکور ہوں کہ اسے علی جیسا خاوند ملا ہے۔ اس اہم موقع پر میں بھی یہ اعلان کرتا ہوں کہ آج سے میں اپنی زمینوں کی ملکیت زرینہ کے نام کرتا ہوں۔ زرینہ اور علی جس طرح چاہیں ان زمینوں کے معاملات چلائیں۔

میں نے بھی زرینہ کے ماموں چوہدری فیض صاحب کو کئی دن پہلے کہہ دیا تھا کے وہ زمینوں کے زرینہ کے نام انتقال کے کاغذات تیار کروا دیں۔ اس ضمن میں وہ پہلے ہی خاصی پیش رفت کر چکے ہیں اور باقی معاملات بھی جلدی طے ہو جائیں گے۔"

چوہدری فراغت حسین کی تقریر کے بعد ایک بار پھر حویلی سے ملحقہ گارڈن کی فضا مبارک باد کی صداؤں سے گونج اٹھی۔

بڑے چوہدری صاحب اور چوہدری فراغت حسین کی تقریروں کے دوران تمام میزوں پر نوع و اقسام کے کھانے چن دیئے گئے۔ علی اور زرینہ اوران کے دوستوں کی بھی طویل گھڑ سواری کے بعد بھوک خوب چمک اٹھی تھی چنانچہ سب مبارک بادیں وصول کرتے کھانے کے طرف متوجہ ہوئے۔

سارے گاؤں کے لوگ ضیافت میں موجود تھے۔ اور سب خوش تھے۔ اہل خانہ بھی، مہمان بھی اور اہل گاؤں بھی۔ سب جوش و خروش سے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے کھانے کے دوران پس منظر میں بھیگتی رات میں بینڈ ہلکی آواز میں شادی کی دُھنیں بجا رہا تھا۔

فصل 27

گاؤں واپسی پر چوہدری محمد حسین نے اپنے بیٹے کے کندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی تھی وہ ذہنی طور پر ابھی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اوپر سے زرینہ کے والد نے ساری ذمہ داری زرینہ کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ گویا علی اور زرینہ کو اب چار پانچ سو مربع رقبہ پر مبنی زمین داری کا انتظام سنبھالنا تھا۔

یہ ایک بڑا چیلنج تھا۔ اتنی بڑی زمین داری چلانے کے لیے انہیں ہر طرح کی سہولتیں حاصل تھیں لیکن محض زمین داری میں اُلجھ جانے کا خیال علی کے لیے سوہانِ روح تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ زمین داری کے بکھیڑوں میں پڑتا وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح پاکستان کو پٹڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھے تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا سسٹم اس ملک میں سیٹ ہو جائے جس میں اس سرزمین پر پیدا ہونے والے ہر بچے کے لیے اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق نشوونما پانے کے بھرپور مواقع موجود ہوں۔

فطرت سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے اور سالہا سال تک بیج سے پھوٹنے سے لیکر فصلوں کے پروان چڑھنے تک اور پھل پھول لانے تک کے عمل کا قریبی مشاہدہ کرنے کی وجہ سے علی جانتا تھا کہ افراد اور معاشروں کی نشوونما کے لیے بھی ایسے ہی مناسب عوامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ عوامل میسر ہوں تو افراد اور معاشرے پھلنے پھولنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان عوامل میں سے کسی قسم کی کمی رہ جائے تو افراد اور معاشرے بھی اسی طرح مرجھا جاتے ہیں جیسے پودے۔ اس کے نزدیک افراد اگر نامیاتی جزو تھے تو معاشرہ نامیاتی کل۔

پاکستان کی تخلیق اگرچہ کئی سال پہلے ہوئی تھی لیکن ابھی تک اس کے خدوخال نہیں بن پائے تھے۔ اوپر سے فوج نے ملک پر قبضہ کر لیا اور اسے ایک رجمنٹ کی طرح چلانے کی کوشش کی۔

ایوب خان سے ملنے اوراس کے خیالات جاننے کے بعد وہ خاص طور پر متفکر تھا- وہ جانتا تھا جب فوج زمانہ امن میں جنگی حکمت عملی کے تحت ملک چلائے گی تو اس کا نتیجہ بھی اس تباہی و بربادی کی صورت میں نکلے گا جو فوج کشی کے نتیجے میں نکلتا ہے۔بے تحاشہ قتل وغارت اور بے انتہا تباہی و بربادی۔

لیکن بڑے چوہدری صاحب نے جو ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال دی تھی وہ جانتا تھا کہ ایک دن یہ ذمہ داری اس کے کندھوں پر آنی تھی چنانچہ وہ گاہے بگاہے اس صورت حال کے بارے میں غور وفکر کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں بہت سے خاکے تراش رکھے تھے لیکن ان پر عمل کے بارے میں وہ کچھ متذبذب تھا۔شاید ان خاکوں پر عمل کرنا اس کے لیے قدرے آسان ہوتا اگر معاملہ صرف اس کو اپنے باپ سے منتقل ہونے والی زمینوں تک محدود ہوتا۔اب اپنے والد کی طرف سے ملنے والی زمین سے زیادہ بڑا رقبہ اسے اور زرینہ کو چوہدری فراغت حسین کی طرف سے منتقل ہو چکا تھا تو چیزیں قدرے دشوار دکھائی دیتی تھیں۔

زرینہ نے علی کو ان مسائل کے بارے میں متفکر دیکھا تو اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے بولی کہ وہ کسی قسم کی فکر نہ کرے۔وہ جو بھی کرنا چاہتا ہے، جو بھی اس کے پلان ہیں، جو بھی اس کے ارادے ہیں، بغیر کسی تردد کے ان کی تکمیل کرے۔ اور زمینوں کی ذمہ داری اس پر چھوڑ دے وہ بخوبی سارے معاملات سنبھال سکتی ہے۔

علی نے زرینہ کی خود اعتمادی دیکھی تو تھوڑا مطمئن ہوتے ہوئے بولا کہ وہ سب معاملات سنبھالے گا۔ اگر اس کے دادا پر دادا نے یہ سب کچھ سنبھال رکھا تھا تو اس کی رگوں میں بھی ان کا خون دوڑ رہا ہے۔ لیکن وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق کچھ مختلف کرنا چاہتا ہے۔

جب اس کے دادا اور پر دادا زمینداری چلاتے تھے وہ مختلف زمانہ تھا۔ ملک پر غیر ملکی حکمرانوں کی حکومت تھی۔ ان کے اپنے قوانین تھے اور وہ اپنے طریقے سے معاملات چلاتے تھے لیکن اب پاکستان ایک آزاد ملک ہے۔

اگرچہ پاکستان میں ابھی تک چیزیں واضح شکل اختیار نہیں کر سکیں لیکن ایک آزاد ملک ہونے کی وجہ سے یہاں معاملات اب اور ڈھب سے چلنے چاہئیں۔

زرینہ نے کہا: "اس کے والد کو خوب اندازہ تھا کہ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں اور آخر کار زمینوں کی ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر آنی ہے اس لیے انہوں نے مجھے زمین داری کے معاملات میں بھی اسی طرح ٹرینڈ کیا جیسے دوسرے معاملات میں۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ کب کیا کرنا ہے۔ کس موسم میں کیا بونا ہے۔ کس فصل کو کتنا پانی چاہیے۔ کیسا بیج چاہیے۔ کتنی کھاد چاہیے۔ بوائی کب کرنی ہے۔ کٹائی کب کرنی ہے۔ کھیتوں سے زیادہ سے زیادہ فصل کیسے حاصل کرنی ہے۔ حتیٰ کہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ پٹواریوں اور گرداوروں سے کیسے معاملہ کرنا ہے۔"

"نہیں زری جان یہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ کالج جانے سے پہلے میں اکثر بڑے چوہدری صاحب کا ان معاملات میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

لیکن میں ان سب لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں جن کی زندگیاں ہماری زمینوں سے بندھی ہیں۔ اس گاؤں میں موچی سے لے کر مسجد کے مولوی صاحب تک شاید ہی کوئی گھر ہو گا جس کا ہماری زمینوں پر دارومدار نہ ہو۔ سب کی دال روٹی براہ راست ہماری زمینوں سے چلتی ہے۔" علی نے زرینہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اور پھر یہ صرف ان لوگوں کی زندگیوں کا مسئلہ نہیں ان کروڑوں لوگوں کی زندگی کا مسئلہ جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے طول و عرض میں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں یا بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔

ان کے رہنے کے لیے اچھے گھر نہیں۔ بچوں کی تعلیم کے لیے مناسب سکول اور کالج نہیں، ان کی صحت مند سرگرمیوں کے لیے پارک اور لائبریریاں نہیں، شہروں کے درمیان سفر کے لیے مناسب ٹرانسپورٹ سسٹم موجود نہیں۔ شہروں کی مناسب تعمیر و ترقی کے لیے منصوبے نہیں۔ معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی ویژن نہیں۔

اور اگر آج یہ آٹھ یا نو کروڑ افراد ہیں تو کل بیس کروڑ بھی ہوں گے، تیس کروڑ بھی اور چالیس کروڑ بھی۔ لیکن مسقبل بینی اور مسقبل کے حوالے سے مناسب پلاننگ کا یہاں سرے سے کوئی تصور نہیں۔"

زرینہ نے علی کی بات سن کر کہا: "علی تم جو بھی سوچو، جو بھی کرو، مجھے تم اپنا ساتھی پاؤ گے۔ میری زندگی تم سے شروع ہوتی ہے اور تم پر ختم ہو جاتی ہے۔ میری سب امنگوں، آرزوں، اور خوابوں کا مرکز تم ہو۔ میرے لیے اب تمہارے سوا اس زندگی میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ تم سے شادی کرنے سے پہلے میں نے تم سے محبت کی تھی۔ میں نے تمہیں، دیکھا، پسند کیا اور اپنا لیا۔ میں نے پہلے تم سے محبت کی اور پھر شادی۔ تم پہلے میرے محبوب ہو اور پھر شوہر ۔ اور میری آخری سانسوں تک میرا اور تمہارا یہ رشتہ بر قرار رہے گا۔ تم ہمیشہ پہلے میرے محبوب رہو گے اور بعد میں میرے شوہر۔ تم آئے، تم نے مجھے دیکھا، اور ہمیشہ کے لیے میرا دل اپنی گرفت میں لے لیا۔"

زرینہ بول رہی تھی اور علی پر ایک انجانا سا سحر طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا زرینہ کی باتوں میں ایک ایسی خوشبو ہے جو اس کے رگ و ریشے میں سماتی جا رہی ہے۔ اور وہ رفتہ رفتہ ایک ایسی دنیا میں کھنچ رہا ہے جہاں طوفان ہیں، آندھیاں ہیں، اور پھر طوفانوں سے گزرنے کے بعد سمندر جیسا سکون جس میں جو بھی گرے پانی کی بوند یا برگ گل کوئی ارتعاش پیدا نہ ہو۔

زرینہ کی اس گفتگو سے علی نے زرینہ کو بازووں میں بھینچ لیا اور بے اختیار اس پر بوسوں کی بارش کر دی۔ زرینہ اس کے بازووں میں فالودے کی قلفی کی طرح پگھلتی چلی گئی۔

طوفان

آندھیاں

سمندر

سکون

پانی کی بوندیں

اور

بر گھائے گل

اور سارے میں

پھیلتی

ان جانی خوشبو

ایک خواب

چاند

ستارے

نیلا آسمان

آسمان کی وسعتوں میں

اڑتے پرندے

علی نے کہا: "زرینہ جانتی ہو میں کیا سوچ رہا تھا؟

"کیا سوچ رہے تھے؟" زرینہ نے علی کے بازوؤں میں پگھلتے ہوئے کہا۔

"زرینہ جان میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں اور تم اپنے ماں باپ کی۔"

"جھوٹ"، زرینہ نے علی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم یہ نہیں سوچ رہے تھے لیکن تم فکر نہیں کرو۔ تمہاری زرینہ تمہارے لیے اتنے بچے پیدا کرے گی کہ تمہارے دادا پر دادا جنت میں پریشان ہو جائیں گے کہ ان کا پوتا ان سے زیادہ نمبر کیسے لے گیا۔"

علی نے زرینہ کو اور زیادہ محبت سے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا: "زری جان تم کیا چیز ہو۔ میں جتنا زیادہ تمہیں جانتا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ کم جانتا ہوں۔ اور میرے دل میں تمہیں مزید جاننے کی

خواہش اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ اور میرے بر عکس اتنے کم عرصے میں تم مجھے اتنی اچھی طرح جان گئی ہو کہ اس سے پہلے کہ کوئی خیال میرے ذہن کے نہاں خانوں میں داخل ہو تم اسے جان لیتی ہو۔"

علی کی بات سن کر زرینہ نے پاس ہی پڑے گلاب کے پھولوں میں سے ایک پھول اٹھا کر علی کے ہونٹوں اور رخساروں کو مس کرتے ہوئے کہا:

"علی جان

یہ صرف میں نہیں

ہر عورت

چاہے وہ کسی سے محبت کرتی ہو

یا نہ کرتی ہو

وہ مردوں کی ذات

کے سمندر میں

اٹھنے والے جوار بھاٹے کو

اس طرح پڑھنے کی

صلاحیت رکھتی ہے

کہ مردوں کو کبھی

اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

تمہارے اطمینان کے لیے صرف اتنا کافی ہونا چاہیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ محبت بڑھتی جائے گی۔ اور میں تمہارے سارے معاملات میں تمہارے ساتھ قدم بہ قدم چلتی رہوں گی۔ یہاں تک کہ ہم تمہارے خوابوں کو حقیقت نہ بنا لیں۔

تمہارے خواب خوبصورت ہیں اور تمہارے عزائم بلند۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں دنیا کی خوش بخت ترین عورت ہوں جسے تم جیسا جیون ساتھی ملا ہے۔"

علی نے پھر بے اختیار زرینہ کو بازوؤں میں لے کر گلاب کے سرخ پھول کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اس پر بوسوں کی بارش کر دی۔ اور وہ پھر اس کے بازوؤں میں سمٹی فالودے کی قلفی کی طرح پگھلتی چلی گئی۔

طوفان

آندھیاں

سمندر

سکون

پانی کی بوندیں

اور

برگہائے گل

اور سارے میں

پھیلتی

ان جانی خوشبو

فصل 28

گاؤں واپس لوٹنے کے بعد علی کو شہر کی مصروف زندگی سے فرصت ملی تو اس نے اپنے لیۓ واضح پلان آف ایکشن بنانے کے بارے میں سوچ وبچار شروع کر دی۔

اس نے پاکستان کے سیاسی نقشے کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لینا شروع کیا۔ ان لوگوں کی زندگیوں کے بارے میں سوچ وبچار کی جو تحریک پاکستان کا حصہ تھے۔

ان لوگوں کی زندگیوں کی جزئیات کا گہری نظروں سے جائزہ لیا جو پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے معاملات چلا رہے تھے۔ اسے تحریک پاکستان کے ہراول دستے سے لیکر جنرل ایوب خان تک کوئی ایسا لیڈر دکھائی نہ دیا جس کی شخصیت کے منفی اور مثبت پہلوں کی بیلنس شیٹ میں مثبت پہلو زیادہ ہوں اور منفی کم۔ اسے لیاقت علی خان سے لیکر جنرل ایوب تک کسی لیڈر میں عظمت کی وہ جھلک دکھائی نہ دی جو انسانوں کے جم غفیر کو ایسی منظم اور طاقت ور قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں کہ وہ صدیوں تک ایک صحت مند قوم کی طرح دنیا میں عزت اور آبرو کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔

قائد اعظم محمد علی جناح یقیناً ایک بڑے لیڈر تھے۔ انہوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے پاکستان تخلیق کیا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی کہ وہ تعمیر قوم کا فریضہ سرانجام دے پاتے۔ وہ ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے پاکستان کو ایک نومولود بچے کی طرح تنہا چھوڑ کر فوت ہو گئے۔

انہوں نے ایک قابل وکیل کی طرح پاکستان کا مقدمہ لڑا اور جیتا لیکن وہ برصغیر میں پھیلے مختلف نسلوں، رنگوں اور زبانوں کے مسلمانوں کو ایک قوم بنانے سے پہلے چل بسے۔

پاکستان میں بسنے والے پٹھانوں، پنجابیوں، سندھیوں، بلوچوں اور بنگالیوں میں وہ دھاگے غائب رہے جو ان کو ثقافتی اور لسانی طور پر مختلف ہونے کے باوجود ایک قوم میں تبدیل کر دیتے۔

ہندوستان سے ہجرت کر کے مغربی اور مشرقی پاکستان آنے والے مسلمانوں کے خواب بھی رفتہ رفتہ سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہونا شروع ہوگئے۔ کئی ایک واپس چلے گئے۔ جنہوں نے ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا وہ کبھی ہجرت کے المیے اور چھوڑے ہوئے گلی محلوں کی یادوں سے باہر نہ آسکے۔

اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کی صورت حال مغربی پاکستان سے بھی زیادہ دگرگوں تھی۔ دارالخلافہ پہلے کراچی میں ہونے کی وجہ سے اور پھر اسلام آباد منتقل کرنے کا فیصلہ ہونے کے بعد بنگالی ثقافتی اور لسانی طور پر خود کو پاکستان سے قدرے الگ تھلگ محسوس کرتے تھے۔

کراچی اور اسلام آباد میں وفاقی ملازمت کی وجہ سے آنے والے بنگالیوں کے احساسات ان تارکین وطن جیسے تھے جنہیں معاشی مجبوریوں کی وجہ اپنا ملک چھوڑ کر اجنبی سرزمینوں پر رہائش اختیار کرنا پڑتی ہے۔

ان بنگالیوں کے برعکس مغربی پاکستان سے جو لوگ ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پاکستان جاتے تھے ان کی سوچ وطن کی خدمت کی بجائے کسی کالونی کے اُمور چلانے والوں کی سی تھی۔

لیکن اس سب کے باوجود قائداعظم تنہا شخص تھے جن سے لوگ مشرقی اور مغربی پاکستان میں بے تحاشہ محبت کرتے تھے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے جو محبت قائداعظم کو دی وہ کسی اور لیڈر کو ان کی زندگی میں یا ان کے بعد میسر نہ آسکی۔

قائداعظم کے علاوہ جتنے لیڈر تھے ان کی لیڈرشپ زیادہ تر علاقائی بنیادوں تک محدود تھی۔ قائدِاعظم کے علاوہ کوئی لیڈر صحیح معنوں میں علاقائی، ثقافتی اور لسانی حدود سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ یہی وجہ تھی کہ علی

کو قائد اعظم سے بے پناہ محبت تھی۔ پاکستان کی مخصوص صورتِ حال میں قائدِ اعظم کی وفات کے بعد ان کا کوئی متبادل قوم کو مل جاتا تو شاید نومولود ملک اور قوم ایک حقیقی ملک اور قوم بننے کے راستے پر چل نکلتے۔

قائد اعظم کے بعد پاکستان کے افق پر جتنے لیڈر علی کو نظر آئے سب پرچھایوں کی صورت نظر آئے جن کا کوئی حقیقی وجود نہیں تھا۔ لیاقت علی خان سے لے کر ایوب خان تک سب لیڈر ایسی پرچھائیاں تھے جو پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے مختلف النوع لوگوں کو لٹھا اور ملیشیا تو پہنوا سکتے تھے لیکن انہیں ایک گلدستہ بنانے کے لیے جن اداروں کی ضرورت تھی ان کی تشکیل ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

علی نے بہت غور کیا کہ آخر ایسا کیوں تھا۔ ہندوستان میں گاندھی جی تھے جن کا سیاسی فلسفہ ان کے مذہبی اور اخلاقی فلسفے سے بر آمد ہونے کے باوجود برصغیر میں آباد مختلف زبانیں بولنے والوں اور مختلف مذاھب اور ثقافت رکھنے والوں کو متاثر کر رہا تھا۔ نہرو نے بھی پورے ہندوستان میں اپنی لسانی اور ثقافتی حدود سے باہر اتنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ وہ پورے ہندوستان کے غیر متنازعہ لیڈر بن چکے تھے۔

پاکستان میں صورت حال مکمل طور پر مختلف تھی۔ قائد اعظم کے علاوہ کوئی لیڈر نہیں تھا جس کو ملک کے مختلف حصوں میں وہ پذیرائی حاصل ہو جو ہندوستان میں گاندھی جی کو یا جواہر لعل نہرو کو تھی۔

قائد اعظم کے بعد علی کو پاکستان میں صرف دو شخصیات نظر آتی تھیں جو مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کو ایک قوم بنانے میں مددگار ہو سکتی تھیں۔ اور وہ شخصیات تھیں حسین شہید سہروردی اور محترمہ فاطمہ جناح۔

حسین شہید سہروردی مشرقی پاکستان سے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے لیے مغربی پاکستانیوں کے دل میں بھی جگہ پیدا کر لی تھی۔ ان کو مغربی پاکستان کی اشرافیہ میں وہ دسترس حاصل تھی جس کو بنیاد بنا کر وہ ایسا سیاسی کردار ادا کر سکتے تھے جس سے کم از کم ملک کے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع دو حصے باہمی طور پر شیر و شکر ہو جاتے۔

اس کے علاوہ انہیں متحدہ بنگال میں چیف منسٹر کی حیثیت سے اور بعد میں مشرقی پاکستان میں عوامی قوتوں کے ساتھ قریبی طور پر کام کرنے کی وجہ سے جو تجربہ اور بصیرت حاصل تھی وہ کسی اور لیڈر کے پاس نہیں تھی۔

لیکن علی کو سہروردی صاحب کی بطور موقع پرست شخص شہرت پر کافی تحفظات تھے۔ موقع پرست لیڈر بعض اوقات بڑے کام کر جاتے ہیں۔ لیکن ان پر اعتماد کرنا مشکل ہی نہیں بعض اوقات خطرناک بھی ہوتا ہے۔

سہروردی کے برعکس محترمہ فاطمہ جناح نے ابھی تک خود کو پاکستان کی سیاسی آلائشوں پاک رکھا تھا۔ اگرچہ انہوں نے ایوب خان کے مارشل لا پر کافی نرم رویہ اپنایا تھا اور واضح طور پر اس کی مذمت کرنے سے گریز کیا تھا لیکن مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام انہیں قائد اعظم کی ہمشیرہ ہونے کی وجہ سے بہت عزت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ پاکستان کی موجودہ صورت حال میں اگر وہ پاکستان کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ ہو جائیں تو شاید نیشن بلڈنگ کا جو کام ان کے بھائی اُدھورا چھوڑ کر راہیء ملک عدم ہوئے تھے اس کا آغاز ہو سکے۔

ابھی تک علی نے حسین شہدی سہروردی کو فکری طور پر بطور لیڈر مسترد نہیں کیا تھا لیکن اس کے ذہن میں محترمہ فاطمہ جناح کو متحرک کرنا پاکستان کے لیے بہتر آپشن تھا۔

صفدر شاہ، سلیم موٹا، اظہر اور زرینہ نہ صرف علی کے طرز فکر سے متفق تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں وہ اس کی کوششوں کو آگے بڑھانے میں اس کی مدد کریں۔ لیکن علی کے لیے پاکستان کی سیاسی شخصیات کے بارے میں غور و فکر کے باوجود شخصیات زیادہ اہم نہیں تھیں۔

اسے حسین شہید سہروردی کے طرف جو چیز زیادہ مائل کرتی تھی وہ آئینی اور قانونی اداروں کی تشکیل کے بارے میں ان کے نظریات تھے۔ علی جانتا تھا کہ پاکستان میں جتنے مختلف النوع لوگ آباد تھے ان کے فطری طور پر پیدا ہونے والے باہمی تضادات کے لیے ایسے اداروں کا قیام ضروری تھا جہاں ان کے

باہمی ارتباط کا ایسا میکنزم پیدا ہو جاتا کہ وہ اپنے سب تضادات بطریق احسن باہمی بات چیت سے حل کر لیتے۔ ایسے اداروں کے قیام کے لیے ان شخصیات کی ضرورت تھی جن کا سب لوگ بلا تقسیم لسان و ثقافت و خطہ احترام کرتے ہوں۔ علی کی نظروں میں اب اگر پاکستان میں ایسی کوئی شخصیت موجود تھی تو وہ صرف محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔

لیکن سوال یہ تھا کہ محترمہ نے جس طرح اپنے آپ کو قائداعظم کی وفات کے بعد سیاسی معاملات سے الگ تھلگ کر لیا تھا انہیں دوبارہ کیسے اس بات پر تیار کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی میں ایسے ادارے بنانے میں مدد و معاون ثابت ہوں۔

علی اور اس کے ساتھیوں کے باہمی غور و فکر کے دوران ملک میں کئی اور اہم واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے علی کا فوکس محترمہ فاطمہ جناح پر اور بھی زیادہ مرتکز ہوتا چلا گیا۔

جنرل ایوب خان نے پورے ملک میں سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دی تھی۔ ہزاروں سیاسی کارکنوں کو ایبڈو کر کے سیاست بدر کر دیا تھا۔ حسین شہید سہروردی کو پہلے آئین سازی کا حصہ بننے کی دعوت دی گئی۔ جب انہوں نے انکار کیا تو ان کے انکار پر انہیں گرفتار کیا گیا۔ پہلے حراست میں رکھا گیا اور آخر کار ملک سے جلاوطن کر دیا گیا۔

اس پس منظر میں علی نے فیصلہ کیا کہ وہ محترمہ فاطمہ جناح سے ملے گا۔ انہیں ایوب خان کے خلاف تحریک چلانے کے لیے آمادہ کرے گا۔ ان کے ذریعے مغربی اور مشرقی پاکستان میں لوگوں کو بتائے گا کہ ایوب خان کی فوجی حکومت کے پاکستان کے مستقبل پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

اس ضمن میں علی، زرینہ ، صفدر شاہ، سلیم موٹا، اور اظہر پہلے بھی گفتگو کر چکے تھے۔ اور چوہدری فراغت حسین نے حامی بھی بھری تھی کہ وہ ان کی محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات کا اہتمام کریں گے۔

علی جب یہ سب باتیں سوچ رہا تھا اس کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار نمایاں تھے۔

زرینہ نے علی کو اس طرح اپنی ذات میں گم دیکھا تو کہنے لگی کہ وہ پاکستان کے بارے میں اتنا متفکر کیوں رہتا ہے؟زرینہ کے سوال کے جواب میں علی نے کہا:

" گزشتہ چند سالوں سے جس طرح پاکستان کے حالات جا رہے وہ ان سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان اگر ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دس قدم پیچھے لڑھک جاتا ہے۔ اور اس کے پیچھے لڑھکنے کی وجہ ہم سب لوگ ہیں۔

اسے محسوس ہوتا ہے کہ سب پاکستانی روزو شب بھاگ رہے ہیں تگ و دو کر رہے ہیں کہ انہیں ہر صورت میں اس نوزائدہ ملک کو ایک عظیم مملکت میں تبدیل کرنا ہے لیکن ساری دوڑ دھوپ کے باوجود دن کے اختتام پر وہ ایک انچ آگے نہیں بڑھ پاتے۔

اسے اس بات پر دکھ نہیں ہوتا کہ عام پاکستانیوں کو لٹھا بھی کوٹے سے فی گز فی خاندان کے حساب سے خریدنے کے لیے ملتا ہے۔ بلکہ دکھ اس بات پر ہوتا ہے کہ پاکستانی لیڈروں میں وہ ویژن موجود نہیں جو کسی ملک کو ایک عظیم ملک اور کسی قوم کو ایک عظیم قوم بناتی ہے۔"

"علی جب تم پاکستانیوں کو عظیم قوم بنانے کی بات کرتے ہو اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟" زرینہ نے سوال کے ذریعے علی کے تصور کو مزید مہمیز لگانے کی کوشش کی تو علی کے خیالات آبشار بن کر بہنے لگے:

"زرینہ جان عظمت کے بارے میں میں روائتی تصور کا قائل نہیں۔ میں ان مسلمانوں کے فلسفہ حیات پر یقین نہیں رکھتا جن کے نزدیک عظمت کا مطلب سوائے کشور کشائی کے اور کچھ نہیں۔

میں جب پاکستان کو ایک عظیم ملک اور پاکستانیوں کو ایک عظیم قوم بنانے کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ایسے پاکستان کی تعمیر ہے جہاں پر ایک منظم سیاسی نظام ہو جس میں فیصلہ سازی میں زیادہ سے زیادہ لوگ شمولیت کریں۔ جہاں لوگوں کے لیے رہنے کے لیے مناسب گھر ہوں۔ جو ایسے شہروں میں منظم طریقے سے واقع ہوں جن کی مناسب پلاننگ کی گئی ہو۔ جو ایسی تمام سہولتوں سے مزّین ہو جن کی ایک خاندان کو آسودگی کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں سو فیصد ایجوکیشن کی

سہولتیں ہوں۔ جہاں تمام شہریوں کی نشو و نما کے لیے بدرجہ اتم سہولتیں ہوں جو ان کی فطرتی صلاحیتوں کی اس طرح پرورش کریں کہ ان کی شخصیت کے بہترین پہلو نکھر کر اپنے ملک اور ہم وطنوں کو فائدہ پہنچا سکیں۔ جہاں شاعر دنیا کی بہترین شاعری تخلیق کریں۔ جہاں کہانیاں لکھنے والے دنیا کی بہترین کہانیاں لکھیں۔ جہاں ناول نگار ایسے ناول تخلیق کریں کہ دنیا بھر کا ادب ان کا جواب پیدا نہ کر سکے۔ جہاں گلوکار ایسے گیت گائیں کہ دنیا ان کے گیتوں کے حسن کے سحر سے کبھی باہر نہ آ سکے۔ جہاں ڈاکٹر بہترین علاج کریں۔ جہاں سائنسدان ایسے سائنسی تجربات کریں اور سائنسی علوم کے ایسے ذخیرے کو جنم دیں کہ پوری دنیا سائنسی ریسرچ میں ان سے راہنمائی کی طالب ہو۔

جہاں انجینئر اپنی ایجادات سے ایسے شاہکار تخلیق کریں کہ دنیا بھر کے لوگ ان کے شاہکاروں کو دیکھنے اور ان سے سیکھنے کے لیے آئیں۔

جہاں ماہرین تعمیرات ایسی بلڈنگیں اور ایسے پل تعمیر کریں جو حسن اور انجنیئرنگ کا شاہکار ہوں۔ جہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے محبت کرنا جرم نہ ہو۔ جہاں عبادت کرنے والے اتنے سکون، یکسوئی اور انہماک سے عبادت کریں کہ انہیں اپنے ساتھ عبادت کرنے والے کے طریق عبادت اور عقیدے سے کوئی غرض و غایت نہ ہو۔ جہاں خدا اور بندے کا رشتہ اتنا مضبوط ہو کہ کوئی دوسرا بندہ یا ریاست اس میں مداخلت نہ کر سکے۔

جہاں بچوں کو فطرت کے تحفائف سمجھ کر ان سے محبت کی جائے۔ ان کی عزت اور بہترین پرورش کی جائے۔

جہاں عورتیں اور مرد ایک دوسرے کو محض جنسی تسکین یا افزائش نسل کا زریعہ سمجھنے کی بجائے حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کے دوست اور یاور ہوں۔"

وہ بولتا رہا اور زرینہ خاموشی اور دلچسپی کے ساتھ سنتی رہی۔

پاکستان

دھوپ میں چمکتی
برف پوش چوٹیوں
کی سرزمیں
سرسبز وشاداب وادیوں
کی سرزمیں
دریاوں میں بہتے
چمک دار
پانیوں کی سرزمین
جن کی
تہہ میں پڑے سنگریزوں
کی چمک
سورج کی کرنوں
کو شرمادے
پاکستان
لہلہاتے کھیتوں کی
سرزمیں
میلوں ٹھیلوں کی
سرزمیں
چمکتے اور مطمئن
چہروں والے

مزدوروں کی سرزمیں
ڈھول کی تھاپ پر
رنگ برنگی پگڑیوں والے ناچتے
کسانوں کی سرزمیں
زندگی کے
عزم سے بھرپور
چمکدار آنکھوں والے
نوجوانوں
کی سرزمیں
جن کی آنکھوں سے جھلکتی
ذہانت سے مرعوب
فطرت
ان پر
اپنے راز کھولنے
کے لیے
بے قرار ہو
پھولوں جیسے
بچوں اور بچیوں
کی سرزمیں
جن کے قہقہوں میں

ان کے درخشاں
مستقبل کے خواب
ان کے منتظر
ان کے نگران
ان کے آنے کی راہ
دیکھتے ہوں
ان محافظوں کی سرزمیں
جن کی بہادری
کی داستانیں
پاکستان کے دشمنوں
کو ان کے
گھونسلوں میں
دبکے رہنے پر
مائل رکھیں
ان سفیروں کی سرزمین
جن کی ذہانت
دنیا بھر کو امن
کا گہوارہ بنادے۔

زرینہ کے سوال کے جواب میں علی بول رہا تھا اور بولتا جارہا تھا۔ اپنے خوابوں کے پاکستان کی تصویریں بنائے چلا جارہا تھا۔ زرینہ کے چہرے پر روشنیاں اس طرح ناچ رہی تھیں جیسے کسی تاریک رات میں کوئی

شمع اس کے چہرے کے سامنے جل رہی ہو۔

اس نے آگے بڑھ کر علی کے چہرے کو ایک مہرباں دوست کی طرح چوما اور پھر محبت سے اپنی چھاتیوں میں چھپالیا۔

فصل 29

دھان کی فصل پک چکی تھی اور کٹائی کے لیے تیار تھی۔ باسمتی کی خوشبو سے سارا ماحول خمار آلود ہو رہا تھا۔

صفدر شاہ اور سلیم موٹا، علی، زرینہ اور اظہر کے ساتھ رہتے ہوئے پورے دیہاتی ہو چکے تھے۔ ان کی بات چیت میں دیہاتی لب و لہجہ آ چکا تھا۔ انہوں نے اپنا لباس بھی تبدیل کر لیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر دھوتی کرتا پہنتے اور کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں کے ساتھ مل کر ان سے کھیتی باڑی کے طریقے سیکھتے حقہ پیتے اور انہی کی طرح مختلف مسائل کے بارے میں سوچتے اور باتیں کرتے۔

وقت کے ساتھ انہوں نے زرینہ سے کھیتوں میں گھسنے والے سوروں کو کتوں کی مدد سے بھگانا اور کبھی گولی سے مار گرانا بھی سیکھ لیا تھا۔

کبھی کبھار زرینہ کے ساتھ ان کی اڑتی ہوئی مرغابیوں کو مار گرانے کی شرط بھی لگ جاتی۔ جو زرینہ اکثر جیت لیتی اور پھر ہارنے والے کو شرط کے مطابق کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا جس سے صفدر شاہ اور سلیم موٹے کی کھیتی باڑی کے کاموں میں مزید ٹریننگ ہوتی۔

اگر ان کے کالج کے زمانے کا کوئی دوست ادھر آ نکلتا تو انہیں پہچان نہ پاتا کہ یہ وہی صفدر شاہ اور سلیم موٹا تھے جن کے لباس کا سلیقہ کبھی ان کے کالج کے دوستوں کے لیے باعث رشک تھا۔

اگر شہر کا جادو دیہاتی نوجوانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو شہری نوجوان بھی کبھی کبھار دیہاتوں میں رہ کر مکمل دیہاتی بن جاتے ہیں۔ اور اگر ایک بار وہ دیہاتی لائف اسٹائل کے عادی ہو جائیں تو پھر شہری زندگی ان کو بارِ گراں محسوس ہوتی ہے۔

صفدر شاہ اور سلیم موٹا بہت پہلے کالج کے زمانے میں علی کے سیاسی منصوبوں میں شمولیت کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اب انہوں نے دیہاتی زندگی کو اس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا کہ شہری زندگی ان کے لیے قصہ پارینہ بن چکی تھی۔

سردیوں کی راتوں میں روزمرہ کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد رات گئے ڈیرے پر آگ جلانا، ایک دوسرے کے مقابلے میں دانتوں سے گنے چھیل کر چوسنا اور پھر ہیر گانا انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ خاص طور پر سلیم موٹا جب بلند آہنگ میں ہیر پڑھتا تو سننے والے عش عش کر اٹھتے۔

دھان کی کٹائی ابھی جاری تھی کہ زندگی کا وہ لمحہ آن پہنچا جب انسان حقیقی معنوں میں بالغ ہوتا ہے۔ دو دن قبل چوہدری محمد حسین کو نمونیے کا اٹیک ہوا اور وہ دیکھتے دیکھتے منوں مٹی کے نیچے چلے گئے۔ تین پیڑیوں سے چلتے نظام کا سارا بوجھ اب حقیقی معنوں میں علی کے کندھوں پر آن پڑا۔

بڑے چوہدری صاحب کے ہوتے علی نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اس کے اور ابدیت کے درمیان ایک دیوار ہے جو اس کے لیے حصار کا کام کرتی ہے۔ لیکن بڑے چوہدری صاحب کے انتقال کے بعد اسے لگا کہ وہ دیوار ٹوٹ گئی ہے اور اب بڑے چوہدری صاحب کی بجائے وہ خود ابدیت کے سامنے کھڑا ہے۔ دکھ کے ان لمحوں میں زرینہ حقیقی معنوں میں اس کی دوست اور غمگسار ثابت ہوئی۔

جس دن علی بڑے چوہدری صاحب کے جسد خاکی کو اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر کے آیا اس پر ایک کپکپی کی کیفیت طاری تھی۔ سردی کا ایک احساس تھا جو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتا جارہا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب سردی کا احساس تھا جو بڑے چوہدری صاحب کی موت کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ علی نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کی سردی محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کسی طرح اس سردی سے نجات پائے لیکن سردی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ گود میں انگیٹھی لے کر لحاف میں بیٹھ گیا لیکن سردی تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ زرینہ جانتی تھی کہ یہ بڑے

چوہدری صاحب کی موت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا خوف تھا جو سردی کی شکل میں علی کے رگ وریشے کو یخ کر رہا تھا۔

زرینہ نے علی کو اس حال میں دیکھا تو کہا: "علی جان موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کسی کو اس سے مفر نہیں۔ ولی، پیغمبر، امیر، فقیر، عقل مند اور بے وقوف سب کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ساری عمر بیماروں کو ٹیکے لگاتے رہتے ہیں لیکن جب خود موت کا سامنا کرتے ہیں تو سب ڈاکٹری بھول جاتے ہیں- بڑے بڑے فاتح علاقے فتح کرتے ہیں۔ لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔ لیکن جب وہ خود موت کی آہٹ سنتے ہیں ایک بے بس حقیر مکھی کی طرح خود کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لیکن انسان ہونے کے ناطے ہمارا فرض ہے کہ ہم سیاہ رنگ موت سے خوفزدہ ہونے کی بجائے زندگی کے چراغ جلاتے چلے جائیں۔

آج بڑے چوہدری صاحب نہیں رہے لیکن وہ تمہاری شکل میں زندہ ہیں۔ کل ہم نہیں ہوں گے لیکن ہم اپنے بچوں کی شکل میں زندہ رہیں گے اور یہ سلسلہ وقت کے آخری لمحے تک اسی طرح چلتا رہے گا۔ اکٹھے ہم بڑے چوہدری صاحب کے جاری کاموں کو اسی طرح جاری رکھیں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ ہمارے بچوں کی شکل میں زندہ رہیں۔"

زرینہ کی باتوں سے علی کے جسم کی گہرائیوں میں سرایت کرتی ہوئی سردی میں کچھ کمی آئی۔ زرینہ نے لحاف سے انگیٹھی نکال کر ایک طرف رکھی اور خود اس کے ساتھ لپٹ کر لحاف میں لیٹ گئی۔ زرینہ کے جسمانی لمس سے علی فوراً موت کی لاشعوری یخ وادیوں سے زندگی کے سبزہ زار میں واپس لوٹ آیا۔

بڑے چوہدری صاحب کی موت ایک ناقابل تبدیل حقیقت تھی۔ لیکن زرینہ اور مستقبل میں زرینہ کے وجود سے جنم لینے والے بچوں کا تصور بھی ایک حقیقت تھا۔

زرینہ نے اگر ذاتی طور پر علی کو بڑے چوہدی صاحب کی موت کے غم سے تیزی سے باہر آنے میں مدد دی تھی تو صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر نے زمینوں میں کام کے تسلسل کو اس طرح جاری رکھا کہ کسی کو بڑے چوہدری صاحب کی کمی کا احساس تک نہ ہوا۔

لیکن بڑے چوہدری صاحب کی موت کی خبر سب اخباروں نے نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ جس کے نتیجے میں پورے ملک سے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ علی کے ساتھ اظہار افسوس کے لیے آ رہے تھے۔ کچھ لوگ گروپوں کی شکل میں آ رہے تھے اور کچھ تنہا۔

علی کے دادا پردادا سے جس طرح اس کے خاندان کا پاکستان میں اثر ورسوخ چلا آ رہا تھا اس کا اندازہ علی سے افسوس کا اظہار کرنے آنے والے سے بخوبی ہوتا تھا۔

جس دن بڑی چوہدری صاحب فوت ہوئے تھے چوہدری فراغت حسین اور چوہدری فیض بھی علی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ افسوس کا اظہار کرنے کے لیے آنے والوں کے ساتھ بیٹھ کر اور ان کے ساتھ بات چیت کر کے اظہارافسوس کے لیے آنے پر ان کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ بھی افسوس کے لیے آنے والوں میں شامل تھے۔ انہوں نے صدر ایوب خان کی طرف سے بھی علی، چوہدری فراغت حسین اور چوہدری فیض کو پیغام تعزیت پہنچایا اور فاتحہ خوانی کی۔

قائد اعظم کے تمام قریبی ساتھی جو ابھی بقید حیات تھے اور چوہدری محمد حسین کے ہاں ان کی آمد کے موقع پر ان کے ساتھ آتے تھے یا وہاں انہیں ملنے آتے تھے سب اظہار افسوس کے لیے آئے۔ خواجہ ناظم الدین، راجہ غضنفر علی، خان عبدالقیوم خان، قاضی محمد عیسی، لیاقت علی کے دونوں بیٹے اشرف لیاقت علی خان اور اکبر لیاقت علی خان سب نے آ کر علی سے چوہدری محمد حسین کی وفات کی تعزیت کی اور ان کی قبر پر جا کر فاتحہ خوانی کی۔

علی کے لیے سب سے جذباتی لمحہ محترمہ فاطمہ جناح کی اظہار افسوس کے لیے آمد تھی۔ ان کی آمد پر سارا

گاؤں حویلی کے باہر اکھٹا ہو گیا۔ محترمہ کے لیے بھی یہ ایک جذباتی لمحہ تھا کیونکہ وہ کئی بار اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ آچکی تھیں۔

علی، چوہدری فراغت حسین اور چوہدری فیض کے ساتھ اظہار افسوس کے بعد، انہوں نے اس کمرے میں جانے کی خواہش ظاہر کی جس میں قائداعظم ٹھہرا کرتے تھے۔

علی کے دادا نے اپنی زندگی میں قائداعظم کی وفات کے بعد ان کے کمرے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا تھا۔ کسی کو اس کمرے میں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف کمرے کی دیکھ بھال کرنے والے باقاعدگی کے ساتھ چیزوں کو ان کی اصل حالت رکھنے کے لیے کمرے میں آجاسکتے تھے۔

چوہدری محمد حسین نے بھی اپنی زندگی میں اپنے والد کی طرح قائداعظم کے کمرے کی دیکھ بھال کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں گارڈن میں کھلتی تھیں۔ کمرے میں ایک آرام دہ بستر تھا ایک لکھنے کی ٹیبل اور کرسی رکھی تھی جس پر ایک نوٹ پیڈ قلموں کے اس سیٹ کے ساتھ رکھا تھا جو قائداعظم اپنے قیام کے دوران استعمال کرتے تھے۔

ایک دیوار پر قائداعظم کی قد آدم تصویر تھی جس میں وہ انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔ یہ قائداعظم کی ایک نادر تصویر تھی جس میں وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہے تھے۔ مسکراہٹ سے تصویر میں ایک عجیب تازگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

علی کو قائداعظم کی اس تصویر سے عشق تھا۔ بچپن سے اس کی عادت تھی کہ جب کبھی اس کی زندگی میں کوئی اہم واقعہ ہوتا وہ ہمیشہ قائداعظم کی تصویر کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا اور چند لمحے وہاں کھڑے رہ کر کمرے سے باہر آجاتا۔

محترمہ فاطمہ جناح جب علی، زرینہ، چوہدری فراغت حسین اور چوہدری فیض کے ساتھ کمرے میں داخل ہویں تو وہ بھی قائداعظم کی تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ اور پھر دیر تک وہیں کھڑی اپنے بھائی کی تصویر کو دیکھتی رہیں۔

پھر اس بستر کو دیکھا جس پر قائداعظم لیٹا کرتے تھے۔ اس میز اور کرسی کو دیکھا جس پر بیٹھ کر وہ کبھی نوٹ لکھا کرتے تھے ۔ پھر علی سے کہنے لگیں کہ تم نے کمرے کو کتنی اچھی طرح محفوظ کرر کھا ہے۔ ہاں میرے داداجان نے اپنی زندگی میں اس کمرے کو اسی حالت میں رکھنے کا حکم دیا تھا۔ سوائے اس کمرے کی دیکھ بھال کرنے والوں کے کسی کو اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

کمرہ دیکھ کر وہ باہر گارڈن میں بچھی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔ اور پھر قائداعظم کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہنے لگیں: محمد علی کی تصویر دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ ابھی بولے گا فاطی میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مرنے والوں کی تصویریں رہ جاتی ہیں یا یادیں۔ مجھے چوہدری صاحب کی موت پر دلی صدمہ ہوا ہے۔ وہ محمد علی کے بہت قریبی دوست کے بیٹے تھے اور محمد علی کو بہت عزیز تھے۔" علی نے محترمہ کو گفتگو پر مائل دیکھا تو کہنے لگا: " ہم لوگ چاہتے ہیں کراچی آ کر آپ کو ملیں۔ پاکستان کے حالات دیکھ کر دل بہت دکھتا ہے۔ میں جتنے لوگوں سے ملتا ہوں سب کہتے ہیں کہ پاکستان کو اگر کوئی صحیح سمت میں لے جاسکتا ہے تو فقط آپ۔

میں، زرینہ اور میرے دوست آپ سے مل کر آپ سے درخواست کرنا چاہتے تھے کہ آپ ہماری راہنمائی فرمایں تو ہم مل کر آپ کی قیادت میں پاکستان میں ایسے سیاسی نظام کی بنیاد رکھ سکتے ہیں جس سے یہ ایک ملک ایک عظیم ملک میں تبدیل ہو سکتا ہے۔"

زرینہ کہنے لگی: " آپ قائداعظم کی ہمشیرہ ہیں اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور آپ کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔

اگر آپ نے مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام کو پاکستان کے لیے کچھ کرنے کے لیے کہا تو وہ دل و جان سے آپ کی بات سنیں گے۔"

محترمہ نے علی اور زرینہ کی بات پوری توجہ سے سنی اور پھر کہنے لگیں: "ہاں بے شمار لوگ مجھ سے یہی کہتے ہیں۔ میں ان خطوط پر کبھی کبھار سوچتی بھی ہوں۔

جنرل ایوب ایک ڈکٹیٹر ہے۔ محمد علی نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک فوجی ڈکٹیٹر اس کے ملک پر قابض ہو جائے گا۔ فوجیوں کو ہمیشہ اس نے ریاستی معاملات سے دور رہنے کے لیے ہدایت کی۔ لیکن آج یہاں سارے فیصلے ایک فوجی کر رہا ہے۔

تم لوگ جب چاہو مجھے ملنے کراچی آسکتے ہو۔ بلکہ آؤ تو میرے ہاں ٹھہرو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں اگر میں نے کبھی کوئی سیاسی کردار ادا کرنے کے بارے میں سوچا تو تم میرے ہراول دستے میں شامل ہو گے۔ تاہم میری خواہش ہے کہ تم جہاں تک ممکن ہو سکے پاکستان کے سکولوں اور کالجوں میں اور دوسرے سماجی اداروں میں محمد علی کے آئیڈیلز کو زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔"

محترمہ اس گفتگو کے بعد جانے کے لیے تیار ہوئیں تو انہوں نے ایک بار پھر علی کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔

پھر وہ علی، زرینہ، چوہدری فراغت حسین اور چوہدری فیض کے ہمراہ حویلی سے باہر آئیں تو لوگوں کا ایک جم غفیر ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ان کی گاڑی کے ارد گرد کھڑا تھا۔

محترمہ نے وہاں چند لمحے رک کر ان سب لوگوں سے چوہدری محمد حسین کی وفات پر اظہار ہمدردی کیا۔ وہاں ان کے استقبال کے لیے آنے کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیں۔

علی، زرینہ، چوہدری فراغت حسین اور چوہدری فیض پھر اظہار افسوس اور فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔

فصل 30

بڑے چوہدری صاحب کی وفات کے صدمے سے جلد باہر آنا علی کے لیے انتہائی مشکل کام تھا۔ لیکن زرینہ کی محبت، صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر کی اعانت اور ملک بھر سے تعزیت کے لیے آنے والوں کی آمد ورفت سے بہت جلد اس نے زمین داری کی ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ مبذول کی جن سے بروقت عہدہ برآ ہونا ضروری تھا۔

خاص طور پر دھان کی کٹائی اور چھڑائی مکمل ہو چکی تھی اور سب کسان منتظر تھے کہ علی جلد سے جلد ان کا حصہ ان کے حوالے کرے اور اپنا حصہ کھیتوں سے اٹھائے۔ تا کہ وہ زمینوں کو اگلی فصل کی بوائی کے لیے تیار کر سکیں۔

علی چاہتا تھا کہ وہ زمینوں پر فصل کی تقسیم کا نیا نظام متعارف کروائے۔

اب تک صورت حال یہ تھی کہ کسان اور زمیندار کے درمیان بیج اور فصل آدھے آدھے تقسیم ہوتے تھے لیکن باقی سب اخراجات کسان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ جب کہ مالیہ زمین دار ادا کرتا تھا۔

علی چاہتا تھا کہ وہ اس انتظام کو اس طرح تبدیل کرے کہ زمینوں کی آمدن کا ایک حصہ کسانوں کے خاندانوں کی تعلیم اور صحت کا نظام قائم کرنے کے علاوہ ان کی زندگیوں کو بہتر بنانے پر خرچ ہو۔ اس ضمن میں اس نے زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر سے مشورہ کیا۔ انہوں نے علی کے خیال کی تائید کی لیکن انہوں نے کئی ایسے اہم سوال اٹھائے جن پر غور و فکر ضروری تھا۔

زرینہ نے علی سے پوچھا کہ وہ کسانوں کے خاندانوں کے لیے کیسی تعلیم اور صحت کا کیسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے؟

علی نے کہا وہ چاہتا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے پرائمری اور ہائی سکول بنائے اور جب وہ ہائی سکول سے فارغ ہوں تو ان کے لیے کالج بنائے جہاں انہیں ماسٹرز لیول تک تعلیم دی جا سکے۔

اسی طرح صحت کے لیے کئی ایک جدید ہسپتال قائم کرے جہاں کسان اور ان کے افراد خانہ روز مرہ کی معمولی بیماریوں سے لیکر پیچیدہ بیماریوں تک اپنا علاج کروا سکیں۔

تعلیم اور صحت کے نظام کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ چاہتا ہے ابتدائی طور پر جب ان دو شعبوں کی بنیاد رکھی جا چکے تو اس کے بعد اگر اتنے فنڈز اکٹھے ہو جائیں کہ علاقے کی اجتماعی تعمیر و ترقی کے نئے منصوبے بنائے جا سکیں تو پھر فنڈز کو ان پر خرچ کیا جائے۔ اس طرح ہم پاکستان میں ایک ایسا ماڈل علاقہ تیار کریں گے کہ باقی علاقے اس کی تقلید کر سکیں اور اسے بطور نظام اپنا سکیں۔

زرینہ نے علی سے مزید وضاحت چاہتے ہوئے کہا کہ اس میں کسانوں کو کتنا حصہ ڈالنا ہو گا اور وہ خود اس میں کتنا حصہ ڈالے گا؟

اسی چیز پر ابھی میں اپنے ذہن میں غور و فکر کر رہا ہوں کہ اس سارے نظام کو کیسے مرتب کیا جائے؟

سلیم موٹے نے کہا کہ یہ بہت سادہ بات ہے۔ کھیتوں سے ملنے والی تمام پیداوار کو اجتماعی پیداوار قرار دیا جائے اور پھر اپنی ضرورت کی پیداوار کے علاوہ باقی تمام پیداوار سے ہونے والی آمدن کو اجتماعی منصوبوں پر خرچ کر دیا جائے۔

صفدر شاہ نے کہا: "یہ اتنا سادہ معاملہ نہیں جتنا سادہ سلیم موٹا اسے بنا کر پیش کر رہا ہے۔ ہم اب کسانوں کے ساتھ دن رات زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی کہانیاں سنتے ہیں۔ کھیتوں پر گزرتے ان کے شب و روز کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی بیویوں اور بچوں کے بارے میں ان کے خیالات سنتے ہیں اور زندگی کے بارے میں ان کا نقطہ نظر جانتے ہیں۔

وہ بڑے چوہدری صاحب کی بہت عزت کرتے تھے لیکن انہیں احساس تھا کہ اس سارے نظام میں ان کا اپنا کچھ نہیں ہے"

صفدر شاہ کی بات سن کر علی نے کہا: "اس کی سوچ کا مرکزی نقطہ بھی یہی ہے کہ کسانوں کا یہ احساس ختم کیا جائے کہ ان کا اپنا کچھ نہیں اور ایسے کام کیۓ جائیں کہ ان کو احساس ہو کہ وہ یہ سب کچھ اپنے لیۓ،

اپنے بیوی بچوں اور اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کے لیئے کر رہے ہیں۔ اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب انہیں زمینداری کے بنیادی فیصلوں میں شامل کیا جائے۔ زمینوں کے حاصل کے اخراجات پر ان کی نظر ہو، اور ان اخراجات کے نتیجے میں تعمیر پانے والے منصوبوں سے براہ راست انہیں اور ان کے خاندانوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔"

"لیکن یہ سب ہو گا کیسے ؟" اظہر نے پوچھا۔

"اس کے دو طریقے ہیں۔" علی نے اظہر کے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔" ایک یہ کہ تمام کسانوں کو اس نئے انتظام کے بارے میں بتا دیا جائے اور ان کی آمادگی کی صورت میں اس پر فوری عمل شروع کر دیا جائے۔ اور دوسرے رفتہ رفتہ پہلے اپنے حصے سے ان منصوبوں کے لیے فنڈز مختص کیئے جائیں اور جب کسانوں کو تعلیم اور صحت کے منصوبوں سے فائدہ پہنچنا شروع ہو تو پھر مرحلہ وار انہیں ان اجتماعی منصوبوں میں شامل کیا جائے۔"

زرینہ نے کہا: " دوسرا طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ لوگ زیادہ تر روایات کی پیروی کرتے ہیں۔ اس راستے پر چلنا پسند کرتے ہیں جس پر انہوں نے اپنے ماں باپ کو چلتے دیکھا ہوتا ہے۔

اچانک تبدیلی سے انہیں شاک لگتا ہے جسے وہ عموماً پسند نہیں کرتے۔ لیکن جب تبدیلی کے نتیجے میں ان کی زندگی میں بہتری پیدا ہوتی ہے تو وہ باآسانی روایتی راستہ چھوڑ کر نیا راستہ اپنا لیتے ہیں۔

اگر ہم فی الحال بڑے چوہدری صاحب کے نظام کو اسی طرح چھوڑ دیں لیکن اپنے طور پر سکولوں، کالجوں اور ہسپتال کا کام شروع کر دیں اور بعد میں مرحلہ وار کسانوں کو اس پروگرام کا حصہ بنائیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔"

"زرینہ جان لیکن اگر لوگوں کی شمولیت کے بغیر ہم نے یہ پروگرام شروع کر دیا تو وہ اسے اپنا استحقاق سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن عملاً اس کا حصہ نہیں بنیں گے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو بھی کام کیا جائے لوگوں کی شمولیت سے انہیں نفع و نقصان کا حصہ دار بنا کر کیا جائے تا کہ انہیں اندازہ ہو کہ انہوں نے کس چیز کی قربانی دی ہے اور اس کے نتیجے میں انہیں کیا حاصل ہوا ہے۔

اس لیے میرا کہنا ہے کہ ہمیں تمام کسانوں کی میٹنگ بلانی چاہیئے۔ پہلے ان سے ان کے خیالات سننے چاہیں۔ ان کے مسائل اور ان کا حل ان کی زبان سے سننا چاہیئے اور پھر اپنا پلان ان کے سامنے رکھنا چاہیئے اگر وہ پسند کریں تو اس پر عمل ہونا چاہیئے ورنہ موجودہ نظام کو جاری رکھنا چاہیئے۔

علی کے جواب میں زرینہ نے کہا: "یہ خیال زیادہ بہتر ہے۔ ہمیں سب کسانوں کے ساتھ ایک میٹنگ کرنی چاہیئے۔ ان سے کھیتوں سے ہٹ کر ان کی زندگیوں کے بارے میں جاننا چاہیئے، ان کی خواہشوں کی نوعیت سمجھنی چاہیئے، ان کے خوابوں کا ادراک کرنا چاہیئے اور پھر انہی سے پوچھنا چاہیئے کہ وہ کیا سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگیوں کو بہتر کیسے بنایا جاسکتا ہے؟"

علی اور زرینہ کی اس بات سے سب نے اتفاق کیا کہ جن لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی لانا مقصود ہے ان سے ضرور پوچھا جانا چاہئے آیا وہ اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ ان کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیا وہ تبدیلی کے اس عمل میں حصہ دار بننا پسند کریں گے یا نہیں؟

علی کا رقبہ چھوٹا نہیں تھا۔ اس کی زمینوں پر کئی گاؤں آباد تھے جن میں بسنے والے لوگوں کی زندگیوں کا دارومدار براہِ راست یا بالواسطہ اس کے زمینداری کے نظام سے وابستہ تھا۔

یہ بندوبست آج یا کل کی بات نہیں تھی پشت در پشت کئی نسلوں سے یہ سلسلہ چلا آرہا تھا۔ نہ جانے کتنے انسان اس نظام میں پیدا ہوئے اور مرے لیکن یہ نظام چل رہا تھا۔

ایک اچھی یا بری بات اس نظام کے بارے میں یہ تھی کہ کئی پشتوں سے علی کے خاندان میں ایک ہی بیٹا پیدا ہوتا چلا آرہا تھا چنانچہ وہ خاصی ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کے قائل تھے اور ان میں دوسرے زمینداروں والی بات نہیں تھی۔

کسی کو ان سے کوئی ایسی شکایت نہیں تھی جیسی کہ دوسرے زمینداروں کے بارے میں ان کے رحم وکرم پر زندگیاں گزارنے والوں کو ہوتی ہیں۔ علی کے پردادا سے لیکر علی تک سب شرافت کے پتلے تھے۔ وہ اپنے کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں کے ساتھ اپنے خاندان کے افراد کی طرح برتاؤ کرتے تھے جس کے جواب میں وہ بھی ان کی اپنے بڑوں کی طرح عزت کرتے تھے۔

چوہدری محمد حسین کی زندگی میں ان کے ہر حرف کی ہر کسان ایسے توقیر کرتا تھا جیسے اس کے کسی بزرگ نے اسے حکم دیا ہو۔ علی کے ساتھ بھی لوگوں کا رویہ ایسا ہی تھا۔

اس طرح کی صورت حال میں کسی ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچنا ایک ایسا قدم تھا جس کے نتائج غیر یقینی تو تھے ہی ان سے ایسی اکھاڑ پچھاڑ بھی ہو سکتی تھی جس سے سب کچھ درہم برہم ہو سکتا تھا۔ ان احساسات کے ساتھ علی نے سلیم موٹے سے کہا کہ وہ اس کے رقبے پر آباد دیہاتیوں میں ڈھول والے کو کہہ کر منادی کروا دے کہ سب آئندہ اتوار کے دن اس کے ڈیرے پر اکٹھے ہو جائیں۔ تا کہ ان معاملات پر ان سے مشاورت کی جا سکے۔

اگر سب کا اتفاق ہوا تو ہم اس منصوبے پر عمل کریں گے ورنہ لوگوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے کچھ اور سوچیں گے۔

فصل 31

سردیوں کے باوجود سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہوا میں خنکی کی بجائے ہلکی سی حدّت تھی۔ ڈیرے کے ساتھ کھلے کھیت میں سب دیہاتوں سے لوگ آئے بیٹھے تھے اور چہ میگویوں میں مصروف تھے۔

بڑے بوڑھے علی کے دادا جان کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو قصے سنا رہے تھے کہ کس طرح ان کے ہوتے سارے ہندوستان سے بڑے بڑے لیڈر ان سے ملاقات کے لیے گاؤں آتے تھے۔

ان لیڈروں کی وجہ سے ارد گرد کے علاقے سے سب لوگ اکٹھے ہو جاتے تو گاؤں میں میلا لگ جاتا۔ مسلم لیگی لیڈر تو ان سے ملنے آتے ہی تھے لیکن باقی پارٹیوں کے لوگ بھی علیک سلیک کے لیے چلے آتے۔

خود گاندھی جی کئی بار دھوتی پہنے، لاٹھی ٹیکتے، اُن کے پاس آئے کہ وہ متحدہ ہندوستان کی حمایت کریں لیکن قائداعظم کے ساتھ تعلقِ خاطر میں وہ اتنے راسخ تھے کہ کھلے لفظوں گاندھی جی سے کہہ دیا کہ وہ وہی کریں گے جو قائداعظم کہیں گے۔ بلکہ اُنہوں نے گاندھی جی کو مشورہ دیا کہ وہ قائداعظم سے اس سلسلے میں مذاکرات کریں۔ بڑے چوہدری صاحب کی تو بات ہی اور تھی۔ انہوں نے سیاست میں دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے قائداعظم اوران کے ساتھیوں کے علاوہ حویلی کے دروازے سب پر بند کر دیئے تھے۔ وہ قائداعظم کی بھرپور اعانت کرتے لیکن خود عملی سیاست سے دور رہتے۔

علی نے بچپن میں ان سب لیڈروں کی آمد و رفت دیکھی۔ ان کی باتیں سنیں۔ اپنے باپ دادا کی طرح قائداعظم کی محبت میں اسیر ہوا اور پھر کوئی لیڈر اس کے دل میں اس طرح گھر نہ کر سکا۔

حسین شہید سہر وردی کا طرز استدلال اسے اچھا لگتا تھا۔ اُن کے نقطہ نظر سے بھی اُسے اتفاق تھا۔ اور وہ دل سے ان کی عزت بھی کرتا تھا اور کئی بار اُس نے اُن کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ بھی کیا لیکن وقت کے ساتھ اُس کے ذہن میں اُن کا تصور بھی دُھندلا گیا۔

دراصل علی یہ سمجھتا تھا کہ دنیا کے ۹۹ فیصد مسائل ذاتی ملکیت کے تصور سے جنم لیتے تھے۔ اس کے نزدیک ذاتی جھگڑوں سے لیکر ملکی جنگوں تک سب اسی ذاتی ملکیت کے تصور کی پیداوار تھے۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان ایک نئی مملکت کے طور پر وجود میں آرہا تھا اس لیے اس بات کا امکان تھا کہ وہاں اجتماعیت پر مبنی ایسا نظام قائم کیا جا سکے جہاں کروڑوں انسان آسودہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کر سکیں۔

پے درپے حکومتوں کے قبل از آزادی نوآبادیاتی نظام قائم رکھنے کی کوششوں سے وہ قدرے مایوس ہوتا جارہا تھا۔

قائداعظم اگرچہ پارلیمانی نظام حکومت کے حامی تھے۔ لیکن علی کا خیال تھا کہ پارلیمانی جمہوریت میں آئین و قانون کی عملداری قائم ہونے کے بعد سوسائٹی کو بتدریج ایسے نظام میں منظم کیا جا سکتا تھا جہاں نہ کوئی غریب ہو نہ امیر۔ جہاں لوگوں کے معاملات پر لوگوں کا کنٹرول ہو۔ اور وہ اپنے فیصلے باہمی رضا مندی سے خود کریں۔

قومی سطح پر ایسے فیصلے صادر ہونے سے مایوس ہونے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ خود اپنے علاقے میں ایسا نظام قائم کرے۔

اس کی دعوت پر آج اس کے ڈیرے پر ہونے والے اکٹھ کا بنیادی طور پر یہی مقصد تھا۔

جب وہ زرینہ کے ہمراہ ڈیرے پر پہنچا اس کی ہدایات پر صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر نے پہلے ہی لوگوں کو بتا دیا تھا کہ علی نے ان کو وہاں آنے کی زحمت کیوں دی ہے۔

قبل از آمد لوگوں کو اطلاع دینے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ باہمی غور و فکر کر لیں تا کہ اُنہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔

علی اور زرینہ جب پنڈال میں داخل ہوئے تو لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ انہوں نے اُسے دیکھ کر نعرے لگائے لیکن اُس نے اُنہیں نعرے لگانے سے منع کر دیا۔

پھر مجمعے سے مخاطب ہوتے ہوے بولا: "یہاں جتنے لوگ جمع ہیں سب ایک دوسرے کو کئی نسلوں سے جانتے ہیں۔ ہمارے باپ دادا ایک ساتھ کام کرتے چلے آئے ہیں۔ زندگی کے کئی اتار چڑھاؤ ہم نے اکٹھے دیکھے ہیں۔ چند سال پہلے یہ ایک ہی ملک تھا۔ 1947 میں بٹوارے کے بعد ہم پاکستانی ہیں اور ہندوستان بارڈر کے اُس پار ہے۔

ہمارا ملک جس نظام کے تحت چل رہا ہے ہم سب اس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ ہم اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں لیکن تبدیل نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر سارے پاکستان کے لوگ اکٹھے ہو کر اٹھ کھڑے ہوں تو تبدیلی ممکن ہے لیکن یہ سب لوگ قائداعظم کے ساتھ اکٹھے تھے اُن کے بعد تفریق کا شکار ہیں۔ اپنے مسائل کے حل کے لیے بھی اکٹھے نہیں ہو پاتے۔

اس صورت حال پر میں نے برسوں غور کیا ہے۔ اب میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہو سکتا ہے پاکستان کی سطح پر ایسی چیزیں فی الحال ممکن نہ ہوں لیکن کم از کم ہم اپنے علاقے میں ایسا نظام متعارف کروا سکتے ہیں جس سے آپ لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی آ ے۔

سب سے پہلے میں بتانا چاہتا ہوں کہ تبدیلی سے میری کیا مراد ہے۔ جب میں تبدیلی کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہوتی ہے کہ آپ کا رہنے سہنے کا معیار بلند کیا جائے۔ آپ کے رہنے کے لیے اچھے اور کشادہ گھر ہوں۔ آپ کے بچے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کریں۔ بیماری کی شکل میں آپ کو بہترین علاج کی سہولتیں میسر ہوں۔ آپ ایک خوشحال اور پر سکون زندگی گزاریں۔ بھوک، افلاس اور ننگے پن کا آپ کی زندگیوں پر سایہ نہ پڑنے پائے۔

یہ سب کچھ کرنے کے لیے مجھے آپ کی اجازت اور آپ کا تعاون چاہیۓ ہو گا۔ علی کی باتیں سن کر مجمع میں موجود لوگوں کے چہروں پر قوس و قزح کے رنگ پھیل رہے تھے۔

وہ ایک ایسی بات سن رہے تھے جو اُنہوں نے اپنی زندگیوں میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ سب امید اور اور ناامیدی کی پینگوں پر جھول رہے تھے۔ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟

چوہدری علی حسین ہمارے لیے یہ سب کیوں کرنا چاہتا ہے؟ ہمارے باپ داداؤں نے اس کے باپ داداؤں کے کھیتوں پر کام کرتے اپنی زندگیاں گزاری ہیں۔ ہم بھی اس کے کھیتوں پر کام کرتے زندگیاں گزارنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر یہ کیوں ہماری زندگیوں میں تبدیلی لانا چاہتا ہے؟

علی نے اپنی بات جاری رکھی:

لیکن یہ سب کرنے کے لیے ہمیں ماضی سے ہٹ کر سارے کام کچھ الگ طریقے سے کرنے ہوں گے۔ آپ کو روپے میں سے اپنے پچاس پیسوں کے حق سے دست بردار ہونا ہو گا۔ اور مجھے بھی روپے میں سے اپنے پچاس پیسوں کے حق سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

اس نظام کے تحت آپ اسی طرح زمینوں پر کام کریں گے جیسے کرتے آئے ہیں اور سرکاری طور پر یہ زمینیں اسی طرح میرے نام رہیں گی لیکن ان کے حاصل پر ہم سب کا مشترکہ حق ہو گا۔

ان زمینوں سے جتنی پیداوار ہو گی اس میں سے ہر خاندان کو اس کی ضرورت کے مطابق حصہ ملے گا۔ اور باقی پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدن ان منصوبوں پر خرچ کی جاے گا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

ہو سکتا ہے پہلے چند سال مشکل ہوں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ایک بار یہ نظام چل پڑا تو وہ سارے کام ہوں گے جن کا میں نے آپ کے سامنے اظہار کیا ہے۔

یہ ساراکام کرنے کے لیے آپ ایک دس رکنی کمیٹی مقرر کریں گے جس کی کارکردگی پر آپ ہر وقت نظر رکھیں گے۔ اگر کسی وقت آپ محسوس کریں کہ کمیٹی کا کوئی رکن ٹھیک کام نہیں کررہا تو آپ اسے کمیٹی سے ہٹا کر کوئی دوسرا رکن منتخب کرسکتے ہیں۔

یہ کمیٹی اس علاقے میں قائم ہونے والے سکولوں اور کالجوں اور ہسپتالوں کے نظام کی نگرانی کرے گی۔ زمینوں سے ہونے والی آمدن کا حساب رکھے گی۔ جن مصنوعات سے متعلقہ انڈسٹری ہم لگا سکیں گے اُس انڈسٹری کو لگانے اور چلانے کا اہتمام کرے گی۔ موجودہ کچے گھروں کو رفتہ رفتہ مسمار کرکے ان کی جگہ نئے گھر بنائے گی جن میں ٹھنڈے اور گرم پانی کا انتظام ہو گا۔ تمام دیہاتوں کو کشادہ سڑکوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملایا جائے گا۔ تمام دیہاتوں کی صفائی ستھرائی کا خاص طور پر انتظام کیا جائے گا تاکہ بیماریوں کی روک تھام کی جاسکے۔

زرعی مصنوعات کو شہر لے جانے کی بجائے یہاں اجتماعی منڈی قائم کی جائے گی جہاں شہر سے تاجر آکر مصنوعات خریدیں گے اور شہر لے جائیں گے۔

وہ لوگ جو براہ راست زمینداری کے معاملات سے تعلق نہیں رکھتے جیسے موچی، تیلی، نائی، جولاہے اور مولوی سب کو اس نظام کا حصہ بنایا جائے گا۔ وہ اپنے کام اسی طرح جاری رکھیں گے لیکن ان کو بھی اس نظام کے فوائد حاصل ہوں گے۔

علی نے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ان دیہاتوں میں رہنے والے سب افراد کو یہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اگر کوئی یہاں سے نقل مکانی کرے گا تو اس کے یہ حقوق ساقط ہو جائیں گے۔ لیکن واپسی کی شکل میں اسے دوبارہ یہ سارے حقوق حاصل ہو جائیں گے۔

علی بول رہا تھا۔ زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ چچا کریم علی کے پاس زمین پر بیٹھا تھا۔ وہ علی کی باتیں سن کر کھڑا ہوا۔

"علی بیٹے کیا میرا بھی پکا گھر ہو گا؟"

"ہاں چاچا تمہارا ابھی پکا گھر ہو گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو مجھے اپنا آٹھ آنے حصہ نہیں چاہیے۔ میں تمہارے نظام میں زندہ رہنے کو ترجیح دوں گا۔"

"چاچا تم اکیلے اپنا حصہ نہیں چھوڑ رہے۔ میں بھی اپنا حصہ چھوڑ رہا ہوں۔"

چاچے کریم اور علی کے سوال وجواب نے پورے مجمعے کو جوش وجذبے سے بھر دیا۔

مجمع میں سب لوگوں نے بیک وقت کہا: " چوہدری علی ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا تم اپنے پروگرام پر عمل شروع کرو۔" علی نے کہا اگر یہ بات ہے تو ہم سب سے پہلے پرائمری اسکول کی بنیاد رکھیں گے۔ جس میں بچیاں اور بچے اکٹھے پڑھیں گے۔ پھر ایک بہت بڑا ہال بنائیں گے۔ جو عوام کا ہال ہو گا۔ آئندہ ہم یہاں اس جگہ اکٹھے ہونے کی بجائے اس ہال میں اکٹھے ہوا کریں گے۔ اور سارے معاملات اسی ہال میں طے کیا کریں گے۔

حکومت کچھ کرے نہ کرے ہم اپنی مدد آپ کے تحت اپنے سارے معاملات چلائیں گے -اگر ہمارا نظام کامیاب رہا تو مجھے توقع ہے کہ باقی دیہاتوں میں بھی لوگ ہماری مثال کی پیروی کرتے ہوئے اسی طرح کا نظام کھڑا کریں گے۔

جیسے جیسے یہ نظام پھیلتا جائے گا۔ لوگوں کی زندگی میں تبدیلی آتی جائے گی۔ اور وہ اس نظام کو جاری رکھنے اور بہتر بنانے کے لیے نئے نئے طریقے وضع کریں گے۔

پنڈال میں زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ اس نظام پر ابھی عمل شروع ہو جانا چاہیئے۔

علی پھر بھی چاہتا تھا کہ لوگ اس کے فیصلے کی تصدیق کرنے سے پہلے اچھی طرح غور وفکر کر لیں۔ اور اگر ان کے ذہن میں کچھ شکوک وشبہات ہوں تو ان کی وضاحت ہو جائے۔

اس لیے اس نے پنڈال میں تمام لوگوں کو دعوت دی کہ وہ اس کی تجویز کے بارے میں اپنی رائے دیں۔

مولوی صاحب بھی پنڈال میں موجود تھے۔ انہوں نے علی اور مجمع سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ علی جو کچھ کرنے جارہا ہے وہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کے خیال میں اجتماعی ملکیت کا فلسفہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

لوگوں نے مولوی صاحب کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا اور ان کے بارے میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

مولوی صاحب کے جواب میں علی نے کہا کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ ایک چیز کے دو مالک کیسے ہوسکتے ہیں؟ اللہ نے میرے باپ دادا کو زمین کی ملکیت کا اشٹام لکھ کر نہیں دیا تھا۔ یہ ایک نظام تھا جس کی وجہ سے یہ زمین اُن کی ملکیت قرار پائی--ورنہ زمین کا مالک کون ہو سکتا ہے؟

اور پھر ہنستے ہوے مولوی صاحب سے کہنے لگا کہ مولوی صاحب لوگ سمجھتے ہیں کہ زمین ان کی ملکیت ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زمین کسی کی ملکیت نہیں وہ سب جو سمجھتے ہیں کہ زمین اُن کی ملکیت دراصل وہ زمین کی ملکیت ہیں۔ کوئی مر کر اِس زمین میں جاتا ہے اور کوئی جل کر۔ لیکن آخر کار ہر شخص رزق خاک ہوتا ہے۔

ہاں زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ سب انسانوں کے استفادے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کو پیدا کرنے کے لیے انسانوں کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ جس کا پھل بہر حال اُنہیں ملنا چاہیئے۔ لیکن اس پھل کی وجہ سے کسی کو امیر یا غریب نہیں ہونا چاہیئے۔ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو وہ انسانوں کی اجتماعی بھلائی پر خرچ ہونا چاہیئے۔

ایک اخباری رپورٹر، جس کے بارے میں عام لوگوں کا خیال تھا کہ وہ پولیس اور ایجنسیوں کا مخبر ہے، علی سے بولا اگر زمین کی ذاتی ملکیت کا نظام منہدم ہوا تو ملک کا سارا ڈھانچہ منہدم ہو جائے گا۔ کوئی چیز سلامت نہیں رہے گی۔ اس صورت میں حکومت کو مداخلت کر کے اس عمل کو روکنا ہو گا۔

علی نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ زمین جس کی ملکیت قائم رکھنے کے لیے وہ حکومت کو کشٹ دینا چاہتا ہے فضا میں چھیاسٹھ ہزار چھ سو بائیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑی چلی جا رہی ہے۔ کونسی حکومت ہے جو اتنی رفتار سے اُڑتی ہوئی زمین کی ملکیت کا دعوی کر سکتی ہے۔ ہم اگر اپنے لوگوں کی زندگی میں بہتری لانا چاہتے ہیں تو کسی حکومت کو اس سے کیوں تکلیف ہو گی؟

پنڈال میں بیٹھے لوگ انتہائی دلچسپی سے علی کا مولوی صاحب اور رپورٹر سے مکالمہ سن رہے تھے۔ علی نے جس طرح مولوی صاحب اور رپورٹر کو چپ کروایا تھا سب واہ واہ کر رہے تھے۔

علی نے مولوی صاحب اور رپورٹر دونوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ فکر نہ کریں اس نظام میں ان کے لیے بھی مناسب جگہ ہو گی اور وہ اپنا کام زیادہ عزت اور دیانت داری کے ساتھ کر سکیں گے۔

پنڈال میں بیٹھے تمام لوگوں نے بیک آواز کہا۔ منظور ہے۔ منظور ہے۔ علی کا نظام ہمیں منظور ہے۔ اور پھر بولے یہ نظام اسی فصل سے شروع ہو جانا چاہیئے۔ ہم اگلی فصل کا انتظار نہیں کریں گے۔ ایک اچھے کام کے آغاز کے لیے کل کا انتظار کیوں۔ اُسے آج ہی شروع ہونا چاہیے۔ اور پھر فضا علی حسین زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

فصل 32

علی نے جس نظام کا آغاز کیا تھا اس نے دیکھتے ہی دیکھتے چالیس مربع میل علاقے میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑا دی تھی۔ دو تین سالوں میں لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت کئی پرائمری سکول کھڑے کر دیئے۔ جن کی عمارات کشادہ، خوبصورت، اور جدید سہولیات سے مزین تھیں۔

گاؤں کے تمام افراد، پڑھے لکھے اور ان پڑھ، سکولوں کے معاملات میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔

عوامی ہال جسے علاقے کے وسط میں تعمیر کیا گیا تھا۔ لوگوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

جس کے ذہن میں کوئی نیا خیال یا نئی تجویز ہوتی ہال کی دیوار پر خاص طور پر بنائے گئے بورڈ پر لکھ دیتا۔ لوگوں میں اس پر بحث چھڑ جاتی اور پھر جب لوگوں کا اس تجویز پر اتفاق ہو جاتا تو سب مل کر اُسے حقیقت کا روپ دینے کے لیے کیڑیوں کی طرح منظم جستجو شروع کر دیتے۔

فصلوں کی فروخت کے لیے بنائے گئے سنٹر میں مختلف شہروں سے آنے والے تاجروں کا میلہ لگا رہتا۔

دس رکنی کمیٹی کی سربراہی میں لوگوں نے اپنے کھیتوں میں پیدا ہونے والی فصلوں کی بنیاد پر بننے والی مصنوعات کی ملوں پر کام شروع کر دیا۔

سب کا خیال تھا کہ گھی، آٹے اور چینی کی ملیں لگائی جائیں تاکہ خام اجناس بیچنے کی بجائے گھی، آٹا اور چینی بیچی جائے۔

علی کے اقدامات کے نتیجے میں علاقے میں رونما ہونے والے مقامی انقلاب نے رفتہ رفتہ سارے ملک کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ زیادہ تر لوگ اس علاقے میں ہونے والی تبدیلیوں کو استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن سرکاری پریس اور ملک کے دیگر حصوں کے جاگیر دار اس تبدیلی سے خاصے پریشان تھے۔

سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ملک، جاگیر دار، وڈیرے اور سرداراس رجحان سے پریشان تھے جس کی بنیاد علی نے اپنے علاقے میں رکھی تھی جس کی خبریں سارے پاکستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھیں۔

البتہ مشرقی پاکستان میں ردعمل مختلف تھا۔ جیسے جیسے علی کے کامیاب تجربے کی خبریں مشرقی پاکستان پہنچ رہی تھیں وہاں صحافتی اور سیاسی حلقے ایک طرف اس کی تحسین کر رہے تھے تو دوسری طرف لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے کہ ہوسکے تو سرکردہ لوگ اپنے علاقوں میں علی کی طرح اپنے طور پر ویسا ہی نظام کھڑا کرنے کی کوشش کریں۔

مولانا بھاشانی نے باقاعدہ علی کو دعوت بھجوائی کہ وہ مشرقی پاکستان آکر لوگوں کو اپنے نظام کے بارے میں بتائے۔ انہوں نے علی کو اپنی خدمات پیش کیں کہ وہ پورے مشرقی پاکستان میں جگہ جگہ اس کے لیے جلسوں کا اہتمام کریں گے جہاں وہ لوگوں کو اپنی کامیابی کی داستان سنا سکتا ہے اور اُنہیں اپنے نظام کے میکنزم کی تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے تاکہ وہ بھی ویسا ہی نظام قائم کر سکیں۔

مشرقی پاکستان سے ملنے والی دعوتیں علی کے لیے خاص دلچسپی کا باعث تھیں۔

مغربی پاکستان کے حکمران جس طرح مشرقی پاکستان کو ایک کالونی کی طرح چلا رہے تھے اس پر وہ بہت متفکر تھا۔

اسے کبھی مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن وہ مغربی سے زیادہ مشرقی پاکستان سے محبت کرتا تھا۔ اسے پاکستان کی یہ جغرافیائی جہت اتنی اچھی لگتی تھی کہ وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنی گفتگو میں مشرقی پاکستان کے حوالے دیتا۔ مشرقی پاکستان کے لیے علی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اس نے اِدھر اُدھر سے تھوڑی بہت بنگالی بھی سیکھ لی تھی۔

قاضی نذرالاسلام کی شاعری سے اسے عشق تھا۔ ان کی نظموں کا اردو ترجمہ ہمیشہ اس کے سرہانے پڑا رہتا۔ جب کبھی اُسے موقع ملتا وہ کتاب کھول کر اُونچی آواز میں اُن کی نظمیں پڑھنے لگتا۔

"جواں مرد کہہ دے

میں ہوں ارجمند

ہمیشہ رہے گا

میرا سر بلند

جواں مرد کہہ دے

میں ہوں ارجمند" --- قاضی نذرالاسلام

اس کی سب سے پسندیدہ نظم تھی۔ جب کبھی صفدر شاہ، سلیم موٹا، اظہر اور زرینہ شعر و شاعری کے موڈ میں ہوتے وہ مل کر اونچی آواز میں کورس کے انداز میں گانا شروع ہو جاتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ ایسے لگتا جیسے میدانِ کارزار میں گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔

"جواں مرد کہہ دے

میں ہوں ارجمند

ہمیشہ رہے گا

میرا سر بلند

جواں مرد کہہ دے

میں ہوں ارجمند"

کی تکرار ان کے دلوں میں ایسا جوش بھر دیتی کہ وہ اپنے منصوبوں کے بارے میں مزید پر عزم ہو جاتے۔

جیسے جیسے علی کے قائم کردہ نظام اور اس کی کامیابیوں کی شہرت پھیل رہی تھی حکمرانوں کے ماتھوں پر بل پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ گورنر مغربی پاکستان سے لیکر صدر پاکستان تک جو چند سال پہلے تک علی سے ملاقات اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے اب اس کے نظام کو فیل کرنے کی باتیں کرنے لگے۔

لیکن اس نظام کے اندر ایسی توانائی تھی کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس میں مزید استحکام پیدا ہو رہا تھا اور مزید جان پڑتی جا رہی تھی۔

مشرقی پاکستان میں اپنے نظام کی بڑھتی مقبولیت نے اُس کے اور اُس کے ساتھیوں کے اعتماد میں اتنا اضافہ کر دیا کہ علی نے مشرقی پاکستان جانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔

اتفاق سے انہی دنوں ایوب خان نے اپنے بنائے ہوئے آئین کے مطابق صدارت کے لیے تازہ الیکشنوں کا اعلان کر دیا۔

الیکشن کے اعلان سے ایبڈو اور سرکاری ہتھکنڈوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا مُردہ پن ختم ہوا اور سب سیاسی پارٹیوں نے فوراً الیکشن میں حصہ لینے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔

جانے پہچانے سب سیاست دان سیاست بدر ہو چکے تھے۔ اکٹھے الیکشن کی اسٹیج پر زیادہ تر نو آموز اور ناپختہ کار سیاست دان دکھائی دے رہے تھے۔

ایوب خان نے مکمل اہتمام کیا تھا کہ کوئی پاپولر لیڈر اس کے مقابلے میں کھڑا نہ ہونے پائے۔ اِن حالات میں اپوزیشن پارٹیوں نے مل کر محترمہ فاطمہ جناح کو اپنا اُمیدوار منتخب کر لیا۔

جب محترمہ کی صدارت کے اُمیدوار بننے کی خبریں اخبارات میں چھپیں تو علی خاص طور پر بہت خوش تھا۔ اس کی سوچ تھی کہ محترمہ صدر پاکستان بن جائیں تو قائداعظم کے خوابوں میں رنگ بھرے جا سکتے ہیں اور پاکستان کو ایک ماڈرن ریاست بنایا جا سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں گزشتہ کئی سالوں سے پھیلتی ہوئی بدامنی اور مغربی پاکستان سے بڑھتی ہوئی غیریت پر بھی علی کو بہت تشویش تھی۔ قائداعظم کے بعد پاکستان میں صرف ایک ہی شخصیت تھی جو مشرقی پاکستان کو غیریت کے اِس احساس سے نکال کر دوبارہ مغربی پاکستان کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتی تھی اور وہ تھیں محترمہ فاطمہ جناح ۔

اپوزیشن پارٹیوں کی صدارت کی اُمیدوار بننے کے بعد محترمہ نے بذریعہ ریل مغربی اور مشرقی پاکستان میں لوگوں سے رابطے کا ارادہ کیا۔ اِس ضمن میں اُنہوں اپنے ساتھ جن لوگوں کی ٹیم بنائی اُن میں چوہدری علی حسین کا نام سر فہرست تھا۔

محترمہ نے اپنے فیصلے کے بارے میں علی کو اطلاع دی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کامیابی پر زرینہ بھی انتہائی خوش ہوئی۔ صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر بھی اس خبر سے بہت خوش تھے۔

زرینہ نے اُسی وقت کہہ دیا کہ علی کے ساتھ وہ بھی محترمہ فاطمہ جناح کے عوامی رابطے کی مہم میں حصہ لے گی۔ صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔

علی نے محترمہ فاطمہ جناح کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ ان کے قافلے کا حصہ بننے کے لیے تیار ہے۔ وہ جب چاہتی ہیں، جہاں چاہتی ہیں، وہ اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچ جائے گا۔

علی نے دس رکنی کمیٹی کو محترمہ سے ملنے والے پیغام اور اپنے جواب کی تفصیلات سے آگاہ کیا تو ان میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ جنرل ایوب خان سے قوم کی جان چھوٹے کیونکہ اس کی وجہ سے مغربی اور مشرقی پاکستان میں فاصلے بڑھ رہے تھے۔ قومی وسائل ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اکٹھے ہو رہے تھے جن کا رویہ زیادہ تر عوام دشمنی کا تھا۔

لیکن ان سب کے دل میں کچھ خدشات بھی تھے۔ اُنہیں کسی حد تک اندازہ تھا کہ ایوب خان محترمہ کو کسی طور پر الیکشنوں میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ اور اگر اسے محترمہ کو روکنے کے لیے طاقت استعمال کرنی پڑی تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

علی کو بھی اِس چیز کا بخوبی اندازہ تھا۔ اور زرینہ کو تو پورا یقین تھا کہ محترمہ الیکشن نہیں جیت پائیں گی لیکن وہ خوش تھی کہ پاکستان میں ایک خاتون صدارت کا الیکشن لڑنے جا رہی تھی۔ جس طرح مولوی مودودی نے محترمہ کے الیکشن کے حوالے سے عورت کی حکمرانی کے بارے میں فتویٰ دیا تھا اس سے وہ خاص طور پر محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ محترمہ فاطمہ جناح کو ایک آئیڈیل خاتون کے طور پر دیکھتی تھی۔ علی کا خیال تھا

کہ محترمہ الیکشن تو نہیں جیتیں گی لیکن ان کی وجہ سے پاکستان میں سیاسی جمود ٹوٹ جائے گا۔ اور اس بات کا امکان پیدا ہو جائے گا کہ لوگ آخر کار جنرل ایوب خان کو اقتدار سے باہر پھینک دیں گے۔

علی مانتا تھا کہ ایوب خان کے اقتدار پر قابض ہونے سے پہلے پاکستان کے حالات اتنے اچھے نہیں تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے اقتدارِ اعلیٰ پر قابض ہو جاتا۔ اس کا کہنا تھا کہ ملک میں سیاسی عمل جاری رہنا چاہیے تھا تاکہ عوام پوری آزادی کے ساتھ سیاسی معاملات سے سیاسی انداز میں نپٹتے اور اپنے مسائل اور تضادات کا سیاسی حل اس سیاسی عمل کے ذریعے نکالتے۔ ایک نیا ملک ہونے کی حیثیت سے پاکستان کا ایسے مسائل سے دوچار ہونا ایک فطری عمل تھا۔ اور اس فطری عمل کو سمجھے بغیر اور اسے اپنے تضادات کے حل کا وقت دیئے بغیر ریاست پر قابض ہو کر اُن کا راستہ روکنے کی کوشش دراصل ان تضادات کو گہرا کرنے کے مترادف تھا جس کے آگے چل کر قومی سلامتی کے لیے خطرناک نتائج نکلنے کا امکان تھا۔

علی کا مثبت پیغام ملنے کے بعد محترمہ نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے مشرقی پاکستان جائیں گی۔ کیونکہ مشرقی پاکستان سے اُن کو اپنی تائید میں اٹھنے والی آوازوں میں زیادہ توانائی محسوس ہوتی تھی۔ اُن کی سوچ تھی کہ مشرقی پاکستان میں اگر عوام جمہوری قوتوں کی پشت پر کھڑے ہو گئے تو مغربی پاکستان میں لوگوں کو اُن کا ساتھ دینا پڑے گا۔ ویسے بھی مشرقی پاکستان کے شہری سیاسی و سماجی معاملات میں مغربی پاکستان کے شہریوں سے زیادہ منظم تھے۔ محترمہ چاہتی تھیں کہ بنگالیوں کی اس مثبت طاقت کو پاکستان میں جمہوری تبدیلی کے لیے بروئے کار لایا جائے۔

جس دن محترمہ کی طرف سے علی کو مشرقی پاکستان جانے کا پیغام ملا وہ زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر کے ساتھ سامانِ سفر باندھ کر ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں جب ڈرائیور اُنہیں گاڑی پر ائیر پورٹ چھوڑنے جا رہا تھا تاکہ وہ محترمہ کے قافلے میں شامل ہو سکیں تو وہ کورس کی شکل میں قاضی نذر الاسلام کی نظم کا بند دُہرا رہے تھے۔

"جواں مرد کہہ دے
میں ہوں ارجمند
ہمیشہ رہے گا
میرا سربلند
جواں مرد کہہ دے
جوان مرد۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

فصل 33

علی، زرینہ اور دوستوں کے ساتھ مشرقی پاکستان جانے والے جہاز پر سوار ہوا تو محترمہ فاطمہ جناح اپنے چہرے پر پاکیزہ مسکراہٹ سجائے اپنی ٹیم کے ساتھ ان کی منتظر تھیں۔ اُنہوں نے علی اور اُس کے دوستوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے اُن کا شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے صدارتی الیکشن مہم کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا اور مشرقی پاکستان جانے کے لیے وقت نکالا۔ محترمہ کی ٹیم کے باقی ماندہ افراد تقریباً سبھی علی کو جانتے تھے۔ اُنہیں قائد اعظم کے علی کے باپ اور دادا کے ساتھ تعلقات کی گہرائی کا بخوبی علم تھا۔ اس لیے سب نے علی اور زرینہ کو پُرجوش انداز میں ٹیم کا حصہ بننے پر خوش آمدید کہا اور اس عمل کو محترمہ کی صدارتی مہم کے لیے خوش آئند قرار دیا۔

جہاز میں علی اور زرینہ کی محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ جتنی گفتگو ہوئی اُنہوں نے اُنہیں الیکشنوں کے بارے میں پُراُمید پایا۔ اُنہیں پورا یقین تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں بھرپور مہم چلا کر وہ ایوب کے بنائے گئے الیکٹورل کالج کے نمائندوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ایوب کے مقابلے میں اُنہیں منتخب کریں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم لیگ کے قیام سے لیکر محترمہ فاطمہ جناح کی بطور صدارتی امیدوار تجویز تک سب اچھے اقدامات کی بنیاد بنگال میں رکھی گئی تھی جو اب مشرقی پاکستان کے نام سے پاکستان کا حصہ تھا۔

آبادی کے اعتبار سے بھی مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے زیادہ بڑا تھا۔ سیاسی شعور کے اعتبار سے بھی بنگالی سیاست دان مغربی پاکستان کے سیاست دانوں سے زیادہ باشعور اور زیادہ بالغ النظر تھے۔

مغربی پاکستان میں ایوب خان کے مقابلے میں مناسب امیدوار لانے کے بارے میں گومگو کی جو کیفیت تھی اسے بنگالی سیاست دانوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار بنانے کی تجویز سے ایسی صورت حال میں تبدیل کر دیا جس سے ایوب خان کے پسینے چُھوٹ گئے۔ اب وہی بنگالی سیاست دان محترمہ کے مشرقی پاکستان میں بھرپور استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اپنے مشیروں کے مشورے اور حکومتی مشنری کے استعمال سے ایوب خان نے جس طرح صدارتی مہم کو کنٹرول کر رکھا تھا بنگالی سیاست دانوں نے اپنی بصیرت اور سیاسی ہتھکنڈوں سے اُن شکنجوں کو ملک میں سیاسی تبدیلی کے لیے اِس طرح استعمال کیا کہ ایوب خان کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

جہاز میں محترمہ فاطمہ جناح نے علی اور زرینہ کو مشرقی پاکستان سے ملنے والی دعوتوں کی تفصیل بتائی۔

انہوں نے بتایا کس طرح مشرقی پاکستان کے کونے کونے سے لیڈروں کے پیغامات ملے تھے کہ وہ ان کے علاقے کا دورہ کریں اور وہاں جلسے کریں۔

ایوب خان نے مہم کے لیے جو ٹائم فریم دیا تھا اس میں ممکن نہیں تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہر شہر میں جا کر محترمہ لوگوں سے خطاب کرتیں۔

اُن دنوں اُن کی صحت بھی کوئی قابلِ رشک نہیں تھی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی اپوزیشن پارٹیوں نے کوئی مناسب اُمیدوار نہ ہونے کی وجہ سے اُنہیں مجبوراً اپنا صدارتی اُمیدوار نامزد کر دیا تھا لیکن وہ مالی طور پر اُنہیں کوئی ایسی امداد فراہم نہ کر سکیں جو ایوب خان جیسے آمرِ مُطلق حکمراں کو اقتدار بدر کرنے کے لیے چاہیۓ تھی۔ علی اور زرینہ نے مشرقی پاکستان کے دورے کے اخراجات برداشت کرنے کی پیشکش کی جسے محترمہ نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ نہ ان کے بھائی نے کبھی مسلم لیگ کے کاموں کے لیے کوئی معاوضہ لیا نہ وہ ایسی کوئی امداد قبول کریں گی۔

علی اور زرینہ نے محترمہ سے پوچھا کہ مشرقی پاکستان سے ملنے والی دعوتوں میں سے اُنہوں نے کونسی قبول کی ہیں اور کونسی قبول کرنے سے معذرت کی ہے۔

محترمہ نے علی اور زرینہ کو بتایا کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگی لیڈر چاہتے ہیں کہ وہ ڈھاکہ سے سلہٹ ٹرین پر جائیں اور راستے میں ہر شہر میں جلسوں سے خطاب کریں۔ دوسری طرف کچھ دوسرے لیڈروں کا اصرار ہے ڈھاکہ سے چٹاگانگ تک ٹرین سے سفر کیا جائے اور راستے میں ہر شہر میں محترمہ لوگوں سے خطاب کریں۔

جو لیڈر چاہتے تھے کہ محترمہ ڈھاکہ سے چٹاگانگ تک بذریعہ ٹرین سفر کریں اُن کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ سے چٹاگانگ کی سیاسی پٹی مشرقی پاکستان میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اگر اس پٹی میں محترمہ کے خطاب سے لوگ متحرک ہو گئے تو باقی مشرقی پاکستان خود بخود متحرک ہو جائے گا۔

مشرقی پاکستان کے مسلم لیگی لیڈروں نے دونوں سمتوں میں سفر کے لیے ریلوے کی بوگیاں بُک کروادی تھیں لیکن یہ بات محترمہ پر چھوڑدی تھی کہ وہ ڈھاکہ سے سلہٹ کی طرف سفر کریں گی یا ڈھاکہ سے چٹاگانگ کی طرف۔

علی اور زرینہ نے محترمہ سے کہا کہ اس ضمن میں مشرقی پاکستان کے لیڈروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ڈھاکہ سے چٹاگانگ کا سفر کریں اور جہاں جہاں جلسے کا اہتمام ہو وہاں پر لوگوں سے ملک میں سیاسی تبدیلی کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی درخواست کریں۔

محترمہ نے علی اور زرینہ کے مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ ڈھاکہ پہنچ کر وہاں اپوزیشن پارٹیوں کے مشترکہ اجلاس میں صدارتی انتخاب کے حوالے سے اب تک اُٹھائے گئے اقدامات کا جائزہ لیں گی۔ ذاتی طور پر مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں سے ڈھاکہ آنے والے اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقات کریں گی۔ ان سے رپورٹ لیں گی کہ انہوں نے صدارتی الیکٹرول کالج کے نمائندوں کو کس حد تک تیار کیا ہے کہ وہ ایوب خان کی بجائے اُنہیں صدارت کا ووٹ دیں۔

علی نے قائداعظم کو انتہائی بچپن میں اپنے گھر میں دیکھا تھا اوران کی شخصیت کے خدوخال اس کے ذہن میں دھندلے سے موجود تھے جو محترمہ فاطمہ جناح کو چند بار دیکھنے کے بعد نمایاں ہونے لگے تھے۔ کتنی مماثلت تھی بھائی اور بہن کی شخصیت میں۔ لیکن قائداعظم کی بات ہی کچھ اور تھی۔

سوچ کی گہرائی اور الفاظ کے چناؤ میں قائداعظم کو کمال حاصل تھا۔ وہ جو کچھ کہتے اور کہنے کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کرتے اس سے ان کا مخاطب چاروں شانے چت ہو جاتا۔ جواب دینے کے لیے اُسے اپنے سب حواس مجتمع کرنے پڑتے۔

علی کو محترمہ کے خیالات میں وہ گہرائی دکھائی نہ دی۔ اور الفاظ کے چناؤ پر بھی وہ عبور دکھائی نہ دیا جو قائداعظم کو حاصل تھا۔ لیکن شخصیت کی دلکشی میں قائدِاعظم والی جاذبیت تھی- قائدِاعظم کی ہمشیرہ ہونے کی وجہ سے مغربی اور مشرقی پاکستان میں صرف ان کی ذات تھی جس سے لوگ یکساں محبت کرتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔

محترمہ نے علی اور زرینہ کو بتایا کہ مشرقی پاکستان سے ملنے والی خبروں سے وہ کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں۔ لوگوں میں ون یونٹ کی وجہ سے بے یقینی بڑھ رہی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ون یونٹ کی وجہ سے اُن کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ زبان کے مسئلے پر بھی اُن کے خاصے تحفظات تھے۔ وہ اردو کو قومی زبان بنائے جانے پر اب بھی نالاں تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود ابھی تک اُن کا پاکستان میں اعتماد باقی تھا۔ اُن کا خیال تھا اگر مشرقی پاکستانیوں کے خدشات کا ازالہ نہ کیا گیا تو اِس کے نتائج پاکستان کے لیے اچھے نہیں ہوں گے۔ اُنہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اُنہوں نے صدارتی اُمیدوار بننے کا فیصلہ مشرقی پاکستانیوں کے اصرار پر کیا ہے۔ ورنہ وہ عمر کے آخری دن تک سیاست سے الگ تھلگ رہنا چاہتی تھیں۔ وہ مشرقی پاکستانیوں کو یقین دلانا چاہتی ہیں کہ ان کے مسائل کا حل پاکستان کے اندر موجود ہے۔

علی نے محترمہ کے جواب میں کہا کہ وہ فوج کے اقتدار اعلیٰ پر قابض رہتے ہوئے کیسے بنگالیوں کو مطمئن کریں گی کہ پاکستان کے اندر ان کے مسائل کا حل موجود ہے۔

علی کے سوال پر محترمہ نے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھری اور پھر بولیں کہ فوج کا اقتدار پر قابض ہونا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ ہمارے لوگوں کو ڈکٹیٹروں کی ضرورت نہیں۔

پاکستان ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں قائد اعظم نے رنگارنگ پھولوں کو ایک جگہ اکٹھا ضرور کر دیا ہے لیکن ان کو اکٹھا رکھنے کے لیے ہمیں ابھی گلدان کی تعمیر کی ضرورت ہے۔ اگر ہم وہ گلدان تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ گلدستہ ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ لیکن اگر ہم وہ گلدان نہ بنا سکے تو شاید پھر یہ گلدستہ اکٹھا نہ رہ سکے۔

محترمہ فاطمہ جناح، علی اور زرینہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ جہاز کے پائلٹ نے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اُترنے کی تیاری کا اعلان کر دیا۔ محترمہ اپنی سیٹ پر سمٹ گئیں جبکہ علی اور زرینہ جہاز کی کھڑکی سے چمکتے ہوئے دن میں ڈھاکہ کے خوبصورت ہوائی منظر کا جائزہ لینے لگے۔

اُنہیں ڈھاکہ کا ہوائی منظر بہت خوبصورت دکھائی دیا۔ زرینہ نے کہا: "علی ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ اللہ نے نے ہمیں اتنا خوبصورت وطن عطا کیا ہے۔"

"بالکل۔ قاضی نذرالسلام کی نظموں کی طرح۔" علی نے زرینہ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

فصل 34

مشرقی پاکستان میں ایک جادو تھا -وہ جادو اس وقت علی اور زرینہ کے چہروں پر چمک رہا تھا جو چند لمحوں میں اپنے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان پر پہلی بار قدم رکھنے جا رہے تھے۔

محترمہ پہلے بھی مشرقی پاکستان آ چکی تھیں۔ اُن کی آمد کا مقصد خالصتاً سیاسی تھا۔ لیکن علی کو مشرقی پاکستان سے جو عشق تھا اس میں کلچر، تہذیب، فنون لطیفہ، کاروبار اور سیاست سبھی کچھ شامل تھا۔

حسین شہید سہروردی نے علی کو صرف سیاسی اور فکری طور پر ہی متاثر نہیں کیا تھا بلکہ وہ ثقافتی طور پر بھی مشرقی پاکستان سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا۔

قائداعظم سے اس کی عقیدت کی ایک وجہ مشرقی بنگال کی پاکستان میں شمولیت تھی۔ڈھاکہ میں آمد نے اُسے تقریباً جذباتی بنا دیا۔ وہ زرینہ اور اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا کہ "قائداعظم برصغیر کے عظیم ترین سیاست دان تھے۔ جس طرح انہوں نے مشرقی پاکستان جیسی جادونگری کو پاکستان کا حصہ بنایا تھا یہ صرف اُنہیں کا کارنامہ تھا۔ کوئی اور لیڈر اتنا بڑا کام نہیں کر سکتا تھا۔

اس سے بڑی بات مشرقی پاکستانیوں کا قائداعظم پر اعتماد تھا جس کا اظہار واضح طور پر محترمہ فاطمہ جناح کے ڈھاکہ میں استقبال سے ہو رہا تھا۔

حکومتی ہدایات اور اقدامات کے باوجود لوگ اُمڈے چلے آرہے تھے۔ سانولے سلونے مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان، مزدور، طالب علم، سیاسی کارکن، سائیکل رکشا کھینچنے والے اور ریڑھی بان کھنچے چلے آرہے تھے۔ سب محترمہ فاطمہ جناح کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تقریر سننا چاہتے تھے۔ وہ تقریر جس کا ترجمہ بنگلہ میں اُن کے لیے کسی اور نے کرنا تھا۔

ایوب خان نے مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان کو واضح ہدایات کر دی تھیں کہ مشرقی پاکستان میں محترمہ کا استقبال نہ ہونے پائے۔ لیکن لوگوں نے ایوب خان کی ہدایات کے باوجود محترمہ کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے۔

علی کے دل اور دماغ میں بنگالیوں کا محترمہ فاطمہ جناح کے لیے والہانہ پن دیکھ کر محبت کے طوفان اُمڈے چلے آرہے تھے۔

کتنے سچے، کتنے سادہ اور کتنے محنتی ہیں یہ سب لوگ۔ اس کے تصور میں ان کروڑوں بنگالیوں کی تصویریں دوڑ گیں جو مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں دھان اور پٹ سن کے کھیتوں اور چائے کے باغات میں دن رات کام کرتے تھے۔ یا چٹا گانگ کی پہاڑیوں پر واقع جنگلات اور سندر بن میں لکڑی کی چیڑ پھاڑ اور سدھائے ہوئے ہاتھیوں کی مدد سے اُس کی نقل و حرکت میں لگے رہتے تھے۔

دھان کے میلوں پر پھیلے کھیت اُس نے پنجاب میں بھی دیکھے تھے لیکن مشرقی پاکستان میں دھان کے کھیتوں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ پنجاب میں دھان کی بوائی سال میں صرف ایک بار ہو سکتی تھی لیکن مشرقی پاکستان میں پانی کی بے پناہ فراوانی کی وجہ سے سال میں دھان کی تین تین فصلوں کی بوائی ہوتی تھی۔

پاکستان کا قومی رنگ سبز تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہریالی کے مناظر دیکھ کر اس نے محسوس کیا واقعتاً اگر ہرا رنگ پاکستان کا قومی رنگ بن سکتا تھا تو صرف مشرقی پاکستان کی وجہ سے۔

ڈھاکہ میں تقریباً سارے جانے پہچانے سیاست دان سوائے اُن مسلم لیگیوں کے جو ایوب خان سے مل گئے تھے محترمہ فاطمہ جناح کے استقبال کے لیے پہلے ائیر پورٹ پہنچے اور بعد میں ہوٹل آئے تاکہ مادر ملت کو مشرقی پاکستان میں الیکشن کے سلسلے میں اُٹھائے گئے اقدامات کی تفصیل پیش کریں۔

خود گورنر عبدالمنعم خان بھی محترمہ سے ملاقات کے لیے ہوٹل تشریف لائے۔ اُنہوں نے محترمہ کی

سیکورٹی کے حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کیا اور اُنہیں پولیس کا حفاظتی دستہ فراہم کرنے کی پیشکش کی لیکن محترمہ نے کسی قسم کا حفاظتی دستہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنے ملک اور اپنے لوگوں میں اُنہیں کسی حفاظتی دستے کی ضرورت نہیں۔

ڈھاکہ پہنچنے کے بعد علی کو مسلم لیگی راہنماوں سے ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اُن کی حالت مغربی پاکستان کے مسلم لیگیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ان میں بھی وہ تقسیم چل رہی تھی جس کا مظاہرہ مغربی پاکستان کے مسلم لیگیوں میں دیکھنے میں آ رہا تھا۔

مشرقی پاکستان میں کچھ مسلم لیگی ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ نہ محترمہ فاطمہ جناح کے استقبال کے لیے ائیر پورٹ آئے اور نہ ہوٹل آ کر اُنہیں ملے۔ اُن کی نسبت اپوزیشن پارٹیاں ایوب خان کی مخالفت میں زیادہ متحد تھیں۔ محترمہ کو بھرپور سیاسی کمک بھی اُنہی سے مل رہی تھی۔

یہ اپوزیشن پارٹیاں ہی تھیں جنہوں نے محترمہ کو مشرقی پاکستان آمد کی دعوت دی تھی اور اب مشرقی پاکستان کے اندر اُن کے جلسوں کا بندوبست کر رہی تھیں۔

مشرقی پاکستان میں حسین شہید سہروردی کی پارٹی جو اُن کی وفات کے بعد عوامی مسلم لیگ سے عوامی لیگ میں تبدیل ہو چکی تھی اور جس کی صدارت اس وقت شیخ مجیب الرحمان کر رہے تھے محترمہ فاطمہ جناح کی سب سے بڑی حامی تھی۔

شیخ مجیب الرحمان کا نام علی نے پہلے سے سن رکھا تھا لیکن اس کی کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حسین شہید سہروردی کی طرح علی کو شیخ مجیب الرحمان کے خیالات میں بھی خاصی دلچسپی تھی۔ اسمبلی میں بنگال کے حوالے سے شیخ مجیب الرحمان کی تقریروں کے اسکرپٹ بھی اس نے پوری توجہ سے پڑھ رکھے تھے۔ اور کسی حد تک وہ شیخ مجیب الرحمان سے متفق بھی تھا کہ اگر مشرقی بنگال کو مشرقی پاکستان کی بجائے مشرقی بنگال ہی کہا جاتا تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ اگر پنجاب، سندھ اور بلوچستان اپنے اصل ناموں

سے پاکستان کا حصہ بن سکتے تھے تو مشرقی بنگال کو مشرقی پاکستان کہنا کیوں ضروری تھا۔ بلکہ علی کا ماننا یہ تھا کہ مشرقی بنگال کو مشرقی پاکستان کا نام دے کر اسے ایک الگ ملک کے طور پر دیکھا جارہا تھا۔
مجیب الرحمان جب محترمہ سے ملنے ہوٹل آئے تو علی کو اُنہوں فوراً گلے لگالیا۔ اور پھر علی نے اپنے علاقے میں جو ترقیاتی ماڈل قائم کیا تھا اس کی تعریف کرنے لگے۔
"پاکستان کی تعمیر و ترقی کا یہی ایک راستہ ہے جو تم نے اپنے علاقے میں اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ کام حکومتی پالیسی کے نتیجے میں ہونا چاہیے۔ اگر حکومتی سطح پر ایسا ہو جائے تو پورے ملک کی قسمت بدل سکتی ہے۔"
علی نے شیخ مجیب الرحمان سے اتفاق کرتے ہوے کہا: "اگر محترمہ الیکشن جیت گئی تو ہم کوشش کریں گے کہ ملک میں اس ماڈل کی پیروی کی جائے۔"
شیخ مجیب نے کہا: "وہ اوران کی پارٹی بھی اسی سوچ کے تحت محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کر رہے ہیں۔ اگر وہ الیکشن جیت جاتی ہیں تو ایوب خان کو راستے سے ہٹا کر پاکستان کو دوبارہ صحیح راستے پر ڈالا جاسکتا ہے"
شیخ مجیب صاحب نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوے کہا "مشرقی بنگال میں صورت حال خاصی حد تک عوامی پارٹی اور اس کے اتحادیوں کے کنڑول میں ہے لیکن مولانا بھاشانی ایوب خان سے مل گیا ہے۔ دیہاتوں میں اس کی بات زیادہ چلتی ہے۔"
محترمہ فاطمہ جناح علی اور شیخ مجیب الرحمان کی گفتگو بہت توجہ اور دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ انہوں نے مجیب الرحمان سے ڈھاکہ کے شام کے جلسے اور اگلے دن ٹرین سے چٹاگانگ جانے کے بارے میں تفصیلات دریافت کیں۔ مجیب نے کہا: "ڈھاکہ دیہاڑی دار مزدوروں، کلرکوں، چھوٹے دوکانداروں، سائیکل رکشا والوں، ٹیکسی والوں اور کاروباری لوگوں کا شہر ہے۔ یہاں لوگ آئین اور قانون کی بات کرتے ہیں۔ جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ صوبائی حقوق کی بات کرتے ہیں۔ یہی حال چٹاگانگ اور سلہٹ کا ہے۔ لیکن ڈھاکہ سے چٹاگانگ تک کئی اسٹیشن پڑتے ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے ہر جگہ آپ کی ٹرین کے پروگرام کی منادی کروادی ہے۔ راستے میں پڑنے والی زیادہ تر آبادیاں دھان اور پٹ سن کے

کاشتکاروں سے وابستہ دیہاتیوں کی ہیں۔ وہاں اگر علی والے پروگرام کی بات کی جائے تو لوگ زیادہ دلچسپی لیں گے۔"

محترمہ نے کہا: پیغام ہر جگہ ایک ہی ہو گا۔ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ۔جمہورت کی بحالی اور 1962 کے آئین کی جمہوری اور پارلیمانی آئین میں تبدیلی اور صوبائی خود مختاری۔"

انہوں نے کہا: "علی میری تقریر سے پہلے ہر جگہ اپنے ماڈل ترقیاتی پروگرام کے بارے میں خود بتا سکتا ہے۔اگر اس سے کچھ مدد مل سکتی ہے تو یہ کام اُسے ہی کرنا چاہیے۔"

اس گفتگو کے بعد محترمہ فاطمہ جناح شام کے جلسے سے قبل ستانے کے لیے اپنے سویٹ میں چلی گئیں جبکہ علی، زرینہ، اور علی کے دوست شیخ مجیب کے ساتھ آئے سیاسی ورکر آپس میں حسین شہید سہروردی، عوامی لیگ، اور مشرقی پاکستان کی عمومی سیاسی صورتِ حال پر چائے کی پیالی پر گفتگو کرتے رہے۔ سارا کمرہ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی علی کی محبوب ترین سبز چائے جیسمین کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

فصل 35

ڈھاکہ میں سردیوں کا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ اتنی سردی نہیں پڑتی کہ انسان کو ٹھنڈ سے بچنے کے لیے گرم کپڑے پہننے پڑیں۔ سردیوں میں بھی مرد روزمرہ کا لنگی کرتا پہنے اور عورتیں ساری یا شلوار قمیض میں ملبوس کھلے میں گھومتے پھرتے اور کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

شام کے چار بجے ہوں گے کہ محترمہ فاطمہ جناح علی، زرینہ، شیخ مجیب الرحمان اور سیاسی ورکروں کے ساتھ یونیورسٹی گراؤنڈ میں داخل ہوئیں۔

گراؤنڈ میں ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا سارا ڈھاکہ محترمہ فاطمہ جناح کی تقریر سننے یونیورسٹی گراؤنڈ میں سمٹ آیا ہے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ یونیورسٹی کے استاد اور طالب علم اگرچہ جلسے میں نمایاں تھے لیکن جلسے کا انتظام وانصرام سیاسی ورکروں کے ہاتھ میں تھا۔

اسٹیج پر کھڑے ڈھاکہ ورکرز یونین کے صدر نے لوگوں کو محترمہ کے آنے کی اطلاع دی تو ساری گراؤنڈ مادر ملت زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھی۔

محترمہ نے پہلے اسٹیج پر کھڑے ہو کر لوگوں کے نعروں کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور پھر باوقار انداز میں اسٹیج پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ شیخ مجیب الرحمان اسپیکر کے سامنے کھڑے ہوئے تو حاضرین نے مجیب الرحمان زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ اب وہ جوش و خروش کے ساتھ مادر ملت زندہ باد شیخ مجیب الرحمان زندہ باد کے نعرے تکرار کے ساتھ لگا رہے تھے۔

شیخ مجیب الرحمان نے مائیک سنبھالتے ہوئے کہا: "سردیوں کی اس خوبصورت شام میں، میں یونیورسٹی گراؤنڈ میں آپ کی طرف سے محترمہ فاطمہ جناح کو مشرقی بنگال میں جسے اسلام آباد میں مشرقی پاکستان کہا جاتا ہے خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں خوش ہوں کہ آج بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی بہن اور ساتھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہم نے بطور پارٹی فیصلہ کیا ہے کہ ہم ایوب خان کے مقابلے میں الیکشن میں محترمہ جناح کا ساتھ دیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ محترمہ ہماری بات سمجھ سکتی ہیں اور اُنہیں بانیٔ پاکستان کی ہمشیرہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں جو مرتبہ اور مقام حاصل ہے وہ اس کی بنیاد پر پاکستان کو حقیقی معنوں میں پیپلز ریپبلک بنا سکتی ہیں۔

ہم پاکستان میں مقتدر قوتوں کو شروع سے کہہ رہے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ سوتیلے بھائیوں والا سلوک نہ کریں۔ لیکن کوئی ہماری بات سننے پر آمادہ نہیں۔

مشرقی بنگال کے ساتھ پاکستان کے اقتدار کے ایوانوں میں جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس کے نتائج یہاں عوام میں عیاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

عوام نے یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ مشرقی بنگال سے جو شخص حکومت میں آتا ہے اسے بے عزت کر کے رخصت کر دیا جاتا ہے۔

آج مشرقی بنگال کے عوام پوچھ رہے ہیں کہ خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرا، حسین شہید سہروردی، سب ان کے ساتھ کام کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں اقتدار سے بے دخل کر دیا گیا۔

جیسے جیسے شیخ مجیب الرحمان تقریر کر رہے تھے جلسے میں جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ ان کے آخری جملے پر جلسے میں حاضرین نے بیک آواز نعرے لگانا شروع کر دیے: " ہمیں جواب چاہیئے ۔ سب حساب چاہیئے۔"

شیخ مجیب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: " یہ تو سیاسی باتیں تھیں۔ ہمارے ساتھ معاشی طور پر جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ بھی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ مشرقی بنگال کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ ہے۔ ہم زیادہ غیر ملکی سرمایہ کماتے ہیں۔ لیکن بجٹ کا زیادہ حصہ مغربی پاکستان میں خرچ ہوتا ہے۔ سہولتیں ملتی ہیں تو مغربی پاکستان کے لوگوں کو۔ مشرقی بنگال کی غربت کسی کو دکھائی نہیں

دیتی۔ اُنہیں یہ تو پتہ ہے کہ پٹ سن بیچ کر ڈالر اور پاونڈ کیسے کمانے ہیں لیکن اُنہیں یہ پتہ نہیں کہ پٹ سن کی بوائی سے لیکر ریشہ حاصل کرنے تک ہمارے غریب کسانوں کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کتنی محنت کرنا پڑتی ہے۔ کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے ہیں۔

لیکن اس وقت ہم ان سب باتوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ پاکستان کے اقتدار پر ایک فوجی ڈکٹیٹر کا قبضہ ہے۔

ہم محترمہ کے شکر گزار ہیں کہ اُنہوں نے ہمارا صدارتی اُمیدوار بننا قبول کیا ہے۔ ہم اُنہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم اُن کے ساتھ مل کر فوجی ڈکٹیٹر کو شکست دیں گے۔ اُسے سیاسی طور پر ایسی شکست دیں گے کہ آئندہ کوئی باوردی جرنل پاکستان کے اقتدار پر قابض ہونے کی جُرات نہیں کرے گا۔ " جلسے کے حاضرین نے پھر نعرے بلند کیئے:

" ہم ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ کر کے دم لیں گے۔ ہم ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ کر کے دم لیں گے۔ "

شیخ مجیب نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے علی حسین کو دعوت دی کہ وہ لوگوں سے خطاب کرے۔ شیخ مجیب الرحمان کی دعوت پر علی نے مائیک سنبھالتے ہوئے اپنی تقریر سے پہلے بنگلہ میں لوگوں کو نمشکار اور شبھو شنتا یعنی ہیلو شب بخیر کہا تو سارا مجمع نمشکار نمشکار شبھو شنتا کے نعروں سے گونج اٹھا۔ علی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: " اس نے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کے بعد ہمیشہ حسین شہید سہروردی کو اپنا ہیرو اور سیاسی راہنما جانا ہے۔ اس کے سیاسی خیالات، تصورات اور نظریات بڑی حد تک حسین شہید سہروردی کے افکار کا عکس ہیں۔

وہ مشرقی بنگال کے بہن بھائیوں کے لیے بھی وہی کچھ چاہتا ہے جو مغربی پاکستان کے بہن بھائیوں کے لیے۔ وہ خاندانی اعتبار سے ایک بہت بڑا زمیندار ہے لیکن اس نے اپنی زمینوں کی پیداوار میں زمین پر کام کرنے والوں کو برابر کا حصہ دار بنا دیا ہے۔ وہ ساری پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصہ زمینوں پر کام کرنے والوں اور ان کے امدادی پیشہ وروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ

ان کے اجتماعی مفاد کے کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ اس فلسفے پر چلتے ہوئے ہم نے اپنے علاقے میں کئی سکول اور کالج قائم کئے ہیں۔ کئی سڑکیں بنائی ہیں، کئی ہسپتال قائم کئے ہیں اور کئی ملیں لگائی ہیں جہاں ہماری زمینوں پر پیدا ہونے والا خام مال استعمال ہوتا ہے۔ ملوں کی پیداوار سے ہونے والی آمدن بھی ہم اپنے علاقے کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کر دیتے ہیں۔

ان سارے کاموں کے نتیجے میں ہمارے علاقے میں جو ترقی ہو رہی ہے اس سے ہمارے علاقے کے لوگوں کی زندگیوں میں مسلسل تبدیلی آ رہی ہے۔ ان کا رہن سہن بہتر ہو گیا ہے۔ تعلیم عام ہونے لگی ہے۔ دوسرے علاقوں سے لوگ ملازمتوں کے لیے ہمارے علاقے میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ہم اُنہیں اپنے علاقے میں خوش آمدید کہتے ہیں اور بخوشی اپنے نظام کا حصہ بناتے ہیں۔

اگر آپ کی مدد سے ہم ڈکٹیٹر کو اقتدار بدر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم کوشش کریں گے کہ یہی نظام باقی ملک میں بھی نافذ کریں تاکہ مغربی پاکستان اور مشرقی بنگال کے لوگ بھی اپنے علاقوں کے پیداواری وسائل سے ویسے ہی مستفید ہو سکیں جیسے ہمارے علاقے میں ہو رہے ہیں۔

شیخ مجیب کی طرح میں بھی محترمہ فاطمہ جناح کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے صدارتی اُمیدوار بننے کا فیصلہ کیا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اُنہیں کامیاب بنانے کے لیے آپ اپنی پوری طاقت اور قوت استعمال کریں گے۔ اب میں بانیٔ پاکستان قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مائیک سنبھالیں اور آپ سے خطاب فرمائیں۔ شُھبور فری۔"

یونیورسٹی گراونڈ حاضرین کے نعروں سے گونجنے لگی۔ شُھبور فری۔ مجیب الرحمان زندہ باد، علی زندہ باد۔ مادرِ ملت زندہ باد۔

نعروں کے شور میں محترمہ نے مائیک سنبھالا تو حاضرین میں جیسے بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا۔ اُنہوں نے ایسی نعرہ بازی کی کہ پاکستان بننے سے پہلے جناح صاحب کی جلسوں میں آمد پر لوگوں کے جوش و خروش کی

یادیں تازہ ہو گئیں۔ محترمہ نے مائیک سنبھالتے ہوئے کہا: "اپنے بھائی محمد علی کی وفات کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کی سیاست میں حصہ نہیں لیں گی۔ وہ چاہتی تھیں کہ پاکستان میں کوئی ایسی روایت جنم نہ لے جس سے حکمرانوں کی اولاد خود کو اقتدار کی حق دار سمجھنا شروع ہو جائے۔ لیکن ملک میں فوج کے اقتدار پر قابض ہونے اور مغربی پاکستان اور مشرقی بنگال میں سیاست دانوں کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کے بعد وہ سمجھتی ہیں کہ سیاست سے الگ رہنا ایک جرم ہے۔

وہ صدارتی الیکشن صدر بننے کے لیے نہیں لڑ رہیں۔ بلکہ اس لیے لڑ رہی ہیں کہ پاکستان کو دوبارہ، آئین، قانون اور جمہوریت کے راستے پر ڈال سکیں۔

اگر ہم پاکستان میں آئین اور قانون کی سرپرستی میں جمہوریت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان بہت سی زیادتیوں کا ازالہ ہو جائے گا جن کا ذکر شیخ صاحب نے اپنی تقریر اور آپ نے اپنے نعروں میں کیا ہے۔

پاکستان میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کی فراہمی سے ہم پاکستان کے تمام علاقوں میں ترقی کے یکساں دروازے کھول سکتے ہیں۔ اس شکل میں پاکستان کے حصے ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف بن جائیں گے اور پاکستان قائم کرنے کے مقاصد کی تکمیل ہو سکے گی۔

میں جانتی ہوں ڈکٹیٹر کے موجودہ نظام کے تحت آپ براہ راست ووٹ نہیں ڈالیں گے لیکن آپ اگر اپنی یونین کونسلوں کے ممبروں پر اتنا دباؤ ڈالیں کہ وہ ایک ملڑی ڈکٹیٹر کو ووٹ دینے کی بجائے متحدہ اپوزیشن کی نامزد امیدوار ہونے کی بنا پر مجھے ووٹ دیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہم ان اعلی مقاصد کی ضرور تکمیل کریں گے جن کے لیے علی حسین اور آپ جیسے نوجوان جدوجہد کر رہے ہیں۔

قائداعظم کو آپ لوگوں پر بے پناہ اعتماد اور یقین تھا۔ مجھے بھی آپ پر اتنا ہی اعتماد اور یقین ہے۔ مجھے شیخ صاحب نے بتایا ہے کہ میرے بھائی مولانا عبدالحمید بھاشانی اس وقت کھل کر ہماری حمایت نہیں کر رہے لیکن میں آپ کے توسط سے اُن سے اپیل کرتی ہوں کہ کل وہ ٹرین میں ہمارے ساتھ ڈھاکہ سے

چٹاگانگ چلیں اور وہاں جلسے میں ہمارے ساتھ شامل ہوں تا کہ ہم سب مل کر ڈکٹیٹرشپ کا خاتمہ کر سکیں۔

جلسہ گاہ میں موجود لوگوں نے نعرے لگائے کہ "بھاشانی جی محترمہ کے ساتھ چلو۔ بھاشانی جی محترمہ کے ساتھ چلو۔"

انہی نعروں میں محترمہ فاطمہ جناح نے تقریر ختم کی تو ڈھاکہ لیبر یونین کے صدر نے جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔

محترمہ شیخ مجیب، علی اور زرینہ کے ساتھ اسٹیج سے اتر کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ محترمہ اوران کے ساتھی گاڑی میں بیٹھتے مشرقی پاکستان پولیس نے نقصِ امن اور حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزام میں شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کرلیا اور جیپ میں بٹھا کر کسی نامعلوم مقام کی طرف لے گئی۔

فصل 36

اگلے دن صبح محترمہ فاطمہ جناح، علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا، اظہر ڈھاکہ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو عوام کا ایک جمِ غفیر اُن کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھا۔

شیخ مجیب الرحمان ابھی تک پولیس کی حراست میں تھے اور اُن کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

تاہم اُن کی پارٹی کی دوسری اور تیسری سطح کی لیڈرشپ اپنے ورکروں کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی۔ جماعتِ اسلامی کے ورکر اور لیڈر اپنے الگ جھنڈے اُٹھائے محترمہ کے منتظر تھے۔ جگتو فرنٹ کی پارٹیوں کے قائدین اور ورکرز بھی اپنی اپنی پارٹیوں کے پرچم اُٹھائے مادرِ ملت زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

زرینہ کو ڈھاکہ کا ریلوے اسٹیشن اتنا خوبصورت لگا کہ وہ علی سے مچل کر کہنے لگی مغربی پاکستان میں بھی سب شہروں میں ایسے ریلوے اسٹیشن ہونے چاہیں۔

جگتو فرنٹ میں بھاشانی کی پارٹی کے لوگوں نے محترمہ فاطمہ جناح سے کہا کہ مولانا بھاشانی چینی حکومت کی دعوت پر چین چلے گئے ہیں۔ تاہم ہم ٹرین پر آپ کے ساتھ چٹاگانگ جائیں گے۔ وہاں پہلے سے جلسے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ راستے میں بھی تمام اہم اسٹیشنوں پر لوگ آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔

ٹرین ریلوے اسٹیشن پر پہلے سے موجود تھی جسے جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ ٹرین پر انجن کے سامنے اور ڈبوں کے اوپر جگہ جگہ فریڈم ٹرین کے بینر لگے ہوئے تھے جن کے ساتھ سب اپوزیشن پارٹیوں کے جھنڈے آویزاں تھے۔

ٹرین کے درمیان والا ڈبہ محترمہ اور اُن کی پارٹی کے لیے مخصوص تھا۔ باقی بوگیاں مختلف پارٹیوں کے ورکرز کے لیے مخصوص تھیں۔ فریڈم ٹرین ڈھاکہ کے ریلوے اسٹیشن سے چھوٹ کر شہر کی حدود سے باہر نکلی تو علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر مشرقی پاکستان کے فطرتی حسن میں یوں کھوئے جیسے کہیں پریوں کے دیس میں آ نکلے ہوں۔ اُنہوں نے ابھی تک پنجاب کے سرسبز کھیت دیکھے تھے لیکن مشرقی پاکستان کے ہریالے پن نے اُنہیں اتنا متاثر کیا کہ اُنہیں محسوس ہوا پنجاب کی شادابی تو محض ایک کہانی ہے اور اصل شادابی تو مشرقی پاکستان کی سرزمین کا وہ زیور ہے جسے نہ کوئی چرا سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے۔

محترمہ نے علی اور زرینہ کے چہرے پر مشرقی پاکستان کی خوبصورتی کے دھنک رنگ پھیلتے اور سکڑتے دیکھے تو کہنے لگیں محمد علی کو بھی مشرقی پاکستان کا فطری حسن بہت پسند تھا۔ چٹا گانگ اور رنگا مٹی اُنہیں خاص طور پر بہت اچھے لگتے تھے۔

زرینہ نے محترمہ سے پوچھا کیا چٹا گانگ اور رنگا مٹی اتنے خوبصورت ہیں۔ زرینہ کے جواب میں محترمہ نے کہا یہ ٹرین جیسے جیسے اُس سمت میں سفر کرے گی تمہارا جی چاہے گا کہ تم پنجاب چھوڑ کر یہیں آباد ہو جاؤ۔ اِنہی باتوں میں فریڈم ٹرین اگلے اسٹیشن پر پہنچی تو ہزاروں لوگ مختلف سیاسی پارٹیوں کے جھنڈے اُٹھائے مادرِ ملت زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے اُنہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

اُن کی غربت اُن کے لباسوں سے واضح طور پر جھلک رہی تھی۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں ایک اُمید تھی۔ اُن کے نعروں میں ایک توانائی کا احساس تھا جسے دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے علی نے اپنی بھیگتی ہوئی آنکھوں کو رومال سے ایسے صاف کیا کہ اس کے بنگالیوں کی غربت سے دکھنے والے دل کے دکھ کو کوئی نہ دیکھ پایا۔ نہ زرینہ اور نہ محترمہ فاطمہ جناح۔ نہ صفدر شاہ، نہ سلیم موٹا اور نہ اظہر۔

محترمہ فاطمہ جناح ٹرین کے ڈبے کے دروازے میں اُن سے خطاب کرنے کے لیے کھڑی ہوئیں تو آس پاس کے دیہاتوں سے اُن کے استقبال کے لیے آنے والوں نے اُن کے لیے اپنے دل اور آنکھیں بچھا

دیں۔ محترمہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اُردو میں تقریر کر رہی تھیں-سارا مجمع اتنے انہماک کے ساتھ اُن کی تقریر سن رہا تھا جیسے اُنہیں محترمہ کے ہر لفظ کی سمجھ آ رہی ہو۔

لگتا تھا وہ سب محترمہ کے روپ میں قائد اعظم محمد علی جناح کو دیکھ رہے تھے۔ علی محترمہ کی محبت اور جذبہ دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ آخر قائد اعظم میں کیا بات تھی جو لوگ اُن کے زبان وبیان کو نہ سمجھنے کے باوجود اُن سے اتنی عقیدت رکھتے تھے اور اُن پر اِتنا اعتماد کرتے تھے۔

زرینہ نے علی کی سوچیں پڑھتے ہوے کہا" علی تم محترمہ سے عوام کی محبت دیکھ کر سوچ رہے ہو کہ اُن کے دلوں میں محترمہ کے لیے اتنا والہانہ پن کیوں ہے۔ عوام کی محترمہ سے محبت دراصل قائد اعظم سے اُن کی محبت کا مظہر ہے۔

سچے لیڈر اور عوام کے درمیان ہمیشہ ایک اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے جو دونوں کو اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیتا ہے کہ عوام آنکھیں بند کر کے لیڈر کی پیروی کرتے ہیں اور سچا لیڈر بھی کبھی عوام کو دھوکہ نہیں دیتا۔ اُس کا ہر قدم اُن کی خیر خواہی اور بھلائی میں اُٹھتا ہے۔

جانتے ہو آج پاکستان میں کوئی سچا لیڈر کیوں نہیں ہے؟ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں آج کوئی ایسا لیڈر نہیں ہے جس پر سب علاقوں کے لوگ ایک طرح اعتماد کر سکیں۔

کسی پر بنگالیوں کو اعتماد ہے تو پنجابیوں کو نہیں ہے۔ کسی پر پنجابیوں کو اعتماد ہے تو پٹھانوں اور سندھیوں کو نہیں ہے۔ کسی پر سندھیوں کو اعتماد ہے تو اس پر باقی قومیتوں کو اعتماد نہیں۔

قائد اعظم اس لیے قائد اعظم تھے کہ اُن پر سب اعتماد کرتے تھے۔ اُن سے لوگوں کو اختلاف ضرور ہوتا تھا لیکن اُن کی نیت پر کبھی کسی نے شک نہیں کیا تھا۔

قائد اعظم پر مشرقی بنگال کے لوگوں کو جو اعتماد تھا، یہ محترمہ کے لیے جتنا والہانہ پن تم دیکھ رہے ہو، سب اسی اعتماد کا کرشمہ ہے۔"

ڈھاکہ سے روانہ ہونے کے بعد پہلے اسٹیشن پر جس طرح لوگوں نے محترمہ کا استقبال کیا اس کا سلسلہ چٹاگانگ تک ہر ریلوے اسٹیشن پر دکھائی دیا۔

عام حالات میں ڈھاکہ سے چٹاگانگ تک بذریعہ ٹرین کوئی آٹھ دس گھنٹے کا سفر تھا۔ لیکن جس طرح قریہ قریہ گاؤں گاؤں ہر جگہ لوگ محترمہ کے استقبال کے لیے آئے اور محترمہ کو رُک کر اُن سے خطاب کرنا پڑا یہ سفر کوئی چوبیس پچیس گھنٹے میں طے ہوا۔

فریڈم ٹرین جیسے جیسے چٹاگانگ کی طرف بڑھ رہی تھی مشرقی بنگال کے فطرتی حسن میں اور نکھار آتا جارہا تھا۔ موسم میں بھی قدرے ہلکی خنکی کا احساس ہونا شروع ہو چکا تھا۔

موسم میں بڑھنے والی خنکی کے احساس سے سب نے ہلکے پھلکے سویٹر زیب تن کر لیے۔ زرینہ علی سے شوخی کرتے ہوئے بولی: "لگتا ہے وہ گرمیوں کے موسم میں پنجاب سے نکل کر مری کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔"

علی جواباً بولا: "ہاں میں نے سنا ہے کہ سردیوں کے موسم میں چٹاگانگ میں ڈھاکہ کی نسبت خاصی سردی ہوتی ہے اور ہلکا گرم لباس استعمال کرنا پڑتا ہے۔" اُس نے مزید کہا: "چٹاگانگ ڈھاکہ سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ کسی چینی شاعر نے چٹاگانگ کو ایسی نیم برہنہ حسینہ قرار دیا تھا جو دُھند آمیز پانی سے باہر آرہی ہو۔"

زرینہ نے علی سے خواہش ظاہر کی: "کیا ممکن ہے کہ ہم کچھ عرصہ یہاں رُک جائیں۔"

"جی تو میرا بھی بہت چاہتا ہے۔ لیکن زری جان ہم فی الحال محترمہ کے الیکشن کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی واپس جائیں گے۔ اگر ممکن ہوا تو ہم یہاں ضرور لوٹیں گے اور کچھ وقت یہاں گزاریں گے۔" علی نے زرینہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے جواب دیا۔ علی اور زرینہ کی اِنہی باتوں میں فریڈم ٹرین چٹاگانگ کے اسٹیشن پر آکر رکی تو عوام کا ایک سیلاب محترمہ کے قافلے کا منتظر تھا۔

اپوزیشن کی ساری پارٹیوں کے قائد اور کارکن چٹاگانگ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ لگتا تھا سارا چٹاگانگ ریلوے اسٹیشن پر اُمڈ آیا تھا۔ لوگوں کو ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ ایوب خان کی حکومت کے خلاف نعرے لگارہے تھے: " ڈکٹیٹر کو مار بھگائیں گے۔ محترمہ کو صدر بنائیں گے۔" چٹاگانگ کا ریلوے اسٹیشن " ڈکٹیٹر کو مار بھگائیں گے۔ محترمہ کو صدر بنائیں گے " کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔

اِنہی نعروں کی گونج میں محترمہ کا قافلہ چٹاگانگ زرعی یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوا تو اسٹیشن پر آنے والا سارا ہجوم بسوں، ٹرکوں، اور ریڑھوں پر سوار اُن کی گاڑی کے پیچھے چلنا شروع ہوگیا۔ راستے میں شہر سے مزید لوگ قافلے میں شریک ہوتے چلے گئے۔ میلوں لمبا قافلہ زرعی یونیورسٹی کی گراؤنڈ میں پہنچا تو سورج آسمان پر دو تہائی منزل طے کر چکا تھا۔

جلسہ گاہ میں پہلے سے لاکھوں لوگ محترمہ کے منتظر تھے جو مسلسل نعرے بازی کر رہے تھے۔: "فوجی راج نامنظور۔ فوجی راج نامنظور۔ ڈکٹیٹر کو مار بھگائیں گے۔ محترمہ کو صدر بنائیں گے۔"

لوگوں کے جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے محترمہ نے علی سے کہا کہ جس جذبے سے لوگ مغربی اور مشرقی پاکستان میں ڈکٹیٹر شپ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اِس کے بعد ایوب خان کا اقتدار میں رہنا ناممکن ہے۔

علی نے محترمہ کے جواب میں کہا ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ عوام براہ راست اس الیکشن میں ووٹ نہیں ڈال رہے۔ ایوب خان نے جو نظام کھڑا کیا ہے اِس میں اُس نے گنجائش نہیں چھوڑی کی کوئی اُسے شکست دے سکے۔

عوامی لیگ کے کھنڈکر مشتاق احمد نے اسپیکر سنبھالتے ہوے محترمہ کو اہلِ چٹاگانگ کی طرف سے خوش آمدید کہتے ہوے کہا: "ہمارے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ آج محترمہ فاطمہ جناح ہمارے درمیان موجود ہیں۔

ہم نے پاکستان بنانے کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح کی راہنمائی میں جد وجہد کی تا کہ ہم اپنے فیصلے خود کر سکیں لیکن بد قسمتی سے پاکستان بننے سے لیکر اب تک ہم پر جتنے فیصلے مسلط کیۓ گئے ان کا ہدف مشرقی بنگال کی زبان، ثقافت اور سماج کو بتدریج تباہ وبرباد کرنا ہے۔

سب سے پہلے ہم پر پابندی لگائی گئی کہ ہم اپنے ملک میں اپنی زبان میں کاروبارِ حکومت نہیں چلا سکتے۔ ہمیں اپنے سکولوں کالجوں میں مذھبی بنیادوں پر ٹیگور کی نظمیں پڑھنے سے روکا گیا۔ تعداد میں ہم پوربو پاکستانی پچھمی پاکستانیوں سے کہیں زیادہ ہیں لیکن ہمیں قانونی طور پر ان کے برابر بنا کر مجبور کر دیا گیا ہے کہ ہم پالیسی سازی میں اپنے حقوق کا تحفظ نہ کر سکیں۔

لیکن اب ہم اپنے ساتھ یہ ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔ ہم جمہوری عمل کے ذریعے ملک میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ ہم ڈکٹیٹر شپ ختم کر کے جمہوریت لانا چاہتے ہیں تا کہ ہم اپنے فیصلے خود کر سکیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح نے بروقت ڈکٹیٹر شپ کے خلاف پرچم اٹھایا ہے۔ ہم پوربو پاکستان واسی اُنہیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم اس جد وجہد میں اُن کے ساتھ ہیں۔

حاضرینِ جلسہ نے کھنڈ کر مشتاق احمد کی نعروں سے تائید کی: "ہم محترمہ کے ساتھ ہیں۔ ہم محترمہ کے ساتھ ہیں۔ ڈکٹیٹر کو مار بھگائیں گے محترمہ کو صدر بنائیں گے۔"

کھنڈ کر مشتاق احمد نے سپیکر محترمہ کے حوالے کیا تو حاضرین جلسہ کا جوش و جذبہ دوچند ہو گیا۔ محترمہ نے سپیکر پر نمشکار کہا تو ساری جلسہ گاہ نمشکار نمشکار کی صداؤں سے گونج اٹھی۔

"ہم سے ماضی میں بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔ اردو کو مشرقی بنگال میں قومی زبان قرار دینا غلط تھا۔ مشرقی پاکستان کو ون یونٹ کے تحت عددی برتری سے محروم کرنا غلط تھا۔ مشرقی پاکستان کے وسائل کا مشرقی پاکستان کے عوام پر خرچ نہ ہونا غلط تھا۔

سیاسی اقتدار میں اہلِ بنگال کو بقدر جُثہ حِصہ نہ دینا غلط تھا۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ ہم اِن غلطیوں کا ازالہ کریں۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم قائد اعظم کے نظریات کے مطابق پاکستان کو پارلیمانی جمہوری ملک بنائیں تا کہ آئندہ پاکستان کے کسی حصے سے ناانصافی نہ ہو سکے۔

وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کی سب اکائیوں کو اُن کی شناخت ملے اور پاکستان کے اندر پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع ملیں۔

وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کے ہر شہری کو وہ عزت اور احترام ملے جس کا وہ مستحق ہے اور ترقی کرنے کے مناسب مواقع حاصل ہوں۔ اگر آپ کے نمائندوں نے مجھے صدر منتخب کیا تو میں پوری کوشش کروں گی کہ پاکستان کو آپ کے خوابوں کی تعبیر دوں۔ اسے ایسا ملک بناؤں جس کے لیے مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام نے قائداعظم کی قیادت میں جدوجہد کی تھی۔ کیا آپ ان مقاصد کے حصول میں میری مدد کریں گے؟

سارے حاضرین نے پرجوش انداز میں "ہم محترمہ کے ساتھ ہیں" کا نعرہ لگا کر محترمہ کو یقین دلایا کہ الیکشن میں اُن کی بھرپور حمائت کریں گے۔

محترمہ کا خطاب ختم ہوا تو جس طرح لوگ جلوس کی شکل میں محترمہ کو ریلوے اسٹیشن سے جلسہ گاہ لائے تھے ویسے ہی جلوس کی شکل میں اُن کے ہوٹل لے گئے۔

اور پھر شبھو رفری شبھو رفری کا شور مچاتے رفتہ رفتہ ہوٹل سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

فصل 37

مشرقی پاکستان میں کامیاب انتخابی مہم سے واپسی کے بعد مغربی پاکستان میں محترمہ کا ابھی کراچی سے پشاور تک بذریعہ روڈ انتخابی مہم کا مرحلہ باقی تھا۔

مشرقی پاکستان کے برعکس مغربی پاکستان میں سیاسی قوتوں میں تقسیم زیادہ واضح تھی۔ دائیں بازو کی قوتیں محترمہ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ قوم پرست ترقی پسندوں اور ترقی پسندوں میں محترمہ کا ساتھ دینے پر اختلافات تھے۔ ولی خان اور ان کی پارٹی کا خیال تھا محترمہ کا ساتھ دیا جانا چاہیے کیونکہ وہ ڈکٹیٹر شپ کے مقابلے میں جمہوریت اور جمہوری قوتوں کی نمائندہ تھیں۔ جبکہ سوشلسٹوں اور کیمونسٹوں کا خیال تھا کہ ایوب خان تیزی سے چین کے ساتھ تعلقات بڑھا رہا تھا جس کے اثرات پاکستان پر پڑنے کے کافی امکانات تھے۔ لہذا اِس مفروضے کے تحت محترمہ کا ساتھ دینے کی بجائے ایوب خان کی خاموش حمایت کی جانی چاہیۓ۔ اُن کے خیال میں محترمہ جمہوری قوتوں کی بجائے رجعت پسند قوتوں کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

علی دائیں اور بائیں کی بجائے پاکستان کی سیاست کو ایک بڑے تناظر میں دیکھ رہا تھا۔ اس کا ماننا تھا سیاست ایک ذریعہ تھا لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی لانے کا۔

اِسی وجہ سے اُس نے اپنے علاقے میں اپنے روائتی زمینداری نظام کو خیرباد کہہ کر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھی تھی جس کی وجہ سے گزشتہ چند سالوں میں اُس کے علاقے میں عوام کے رہن سہن، طریقہ ء کار، اور معاشی و معاشرتی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ پُرانے دیہاتوں کی بجائے جدید دیہات اُبھر آئے تھے جہاں سادہ اور کشادہ گھروں میں لوگوں کو زندگی کی سب سہولتیں میسر تھیں۔ کئی ایک پرائمری اور ہائی سکول بن گئے تھے جہاں بچے تعلیم پا رہے تھے۔ چینی، گھی اور کاٹن یارن کی ملیں بن گئی

تھیں جہاں فصلوں سے حاصل کی گئی پیداوار سے فائنل پراڈکٹس تیار کی جارہی تھیں۔ جس سے سارے علاقے میں تاجروں کی آمد ورفت میں اضافہ ہونے لگا تھا اور کئی نئے سرمایہ کار علاقے میں آکر سرمایہ کاری کر رہے تھے اور علی کے کھڑے کیے گئے نظام کا حصہ بنتے جارہے تھے۔

علی کے سُسر چوہدری فراغت حسین اور زرینہ کے ماموں چوہدری فیض علی کے قائم کردہ نظام کی وجہ سے آنے والی تبدیلی اور علاقے کی ترقی سے بہت خوش تھے۔

چوہدری فراغت حسین نے تو دبے لفظوں میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ اُن کے علاقے میں بھی علی کا نظام قائم کر دیا جائے۔ وہ بھی دل سے چاہتے تھے کہ اُن کے علاقے میں رہنے والے کسانوں کی زندگیوں میں بھی تبدیلی آئے۔

لیکن وہ چاہتے تھے کہ علی خود یہ سارا کام کرے۔ تاکہ نظام کے قیام میں کسی غلطی کا احتمال نہ ہو۔ مشرقی پاکستان میں علی نے محترمہ کے ساتھ مل کر جس طرح اُن کی کامیاب انتخابی مہم چلائی تھی اُس کی خبریں ایوب خان کو بھی مل رہی تھیں۔

نواب آف کالا باغ علی کی اپنے علاقے میں زمینداری سے اشتراکیت کی طرف مراجعت سے نالاں تھے۔

تقریباً مغربی پاکستان کے سب زمینداروں اور سرداروں کی طرف سے اُنہیں مسلسل شکایات مل رہی تھیں کہ اُن کے علاقوں میں علی کے قائم کردہ نظام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے بددلی پھیل رہی ہے اور اُن کے علاقوں میں بھی لوگ چاہتے ہیں کہ وہاں علی کا نظام قائم کیا جائے۔ نواب آف کالا باغ یہ سب شکایات مسلسل ایوب خان تک پہنچا رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ایوب خان خود اس بڑھتی ہوئی وبا کو روکیں۔

چنانچہ مشرقی پاکستان سے واپسی کے فوری بعد علی کو ایوب خاں کا پیغام ملا کہ وہ اسے ملنا چاہتے ہیں۔ علی نے

زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر کو ایوب خان کے پیغام کے بارے میں بتایا تو سب نے مشورہ دیا کہ اُن سے ملاقات انتخابات کے بعد ہونی چاہیے۔

اس دوران اظہر کا بھائی میجر امتیاز اُنہیں ملنے چلا آیا۔ میجر امتیاز چاہتا تھا کہ اظہر انتخابی مہم کو چھوڑ کر اپنی زمینوں کی طرف توجہ کرے کیونکہ مقبوضہ کشمیر آمدورفت کی وجہ سے اُس کے لیے ممکن نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اظہر کی عدم دستیابی کی صورت میں زمینوں پر چکر لگائے۔

مقبوضہ کشمیر کے ذکر پر علی، زرینہ، صفدر شاہ، اور سلیم موٹے کے کان کھڑے ہوئے۔ علی نے میجر امتیاز سے پوچھا کہ یہ مقبوضہ کشمیر آمدورفت سے اس کی کیا مراد ہے؟

میجر امتیاز نے علی کو بتایا کہ گزشتہ کئی ماہ سے وہ مسلسل مقبوضہ کشمیر کے اندر گوریلا کاروایاں کر رہے ہیں۔ یہ اُس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر کے اندر اُن کاروائیوں کی نگرانی کرے۔ مقبوضہ کشمیر کے اندر مطلوبہ تعداد میں مطلوبہ جگہوں پر اِس مقصد کے لیے ٹرینڈ کیۓ گئے فوجیوں کو پہنچائے اور اسلحے کی سپلائی کا اہتمام کرے۔

میجر امتیاز کی انفارمیشن سے علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُسے انتخابی مہم سے زیادہ بڑے معاملات دکھائی دینے لگے۔ میجر امتیاز ملاقات کے بعد چلا گیا لیکن علی مسلسل سوچوں میں ڈوبا رہا۔ زرینہ نے علی کو کبھی اس طرح متفکر نہیں دیکھا تھا۔ صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر بھی پریشان تھے۔ انتخابی مہم کی مصروفیات کے باوجود علی انہیں کھویا کھویا دکھائی دے رہا تھا۔

آخر کار زرینہ نے علی سے پوچھا کہ میجر امتیاز سے ملاقات کے بعد وہ ہمہ وقت متفکر کیوں ہے۔ اظہر کا خیال تھا وہ اس پر بھائی جان کے دباؤ کی وجہ سے متفکر ہے۔ لیکن میں کہیں جانے کا نہیں۔ زمینوں کا کاروبار میرے بغیر چل رہا ہے۔ میرے جائے بغیر کسان ٹھیکہ اور فصل میں ہمارا حصہ گھر پہنچا جاتے ہیں چنانچہ مجھے وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟

"نہیں یہ بات نہیں۔ مجھے میجر امتیاز کے انکشافات نے متفکر کر دیا ہے۔ اگر پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے اندر گوریلا کاروایاں جاری رکھیں تو ہندوستان پاکستان کے خلاف کھلی جنگ شروع کر دے گا اور پاکستان موجودہ حالات میں کسی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

علی کی بات سن کا زرینہ نے کہا: " اِس شکل میں تو علی کو ایوب خان سے ضرور ملنا چاہیے اور اِس ضمن میں اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہیے۔"

" ایوب خان سے ملاقات ضرور ہو گی لیکن الیکشن کے بعد۔ ایک بار وہ منتخب ہو جائے تو اُس کی حیثیت فوجی کی بجائے عوامی ہو جائے گی اِس شکل میں وہ بات سننے پر زیادہ آمادہ ہو گا۔" علی نے زرینہ کو جواب دیا۔" کیا محترمہ کی اتنی کامیاب انتخابی مہم کے بعد بھی ایوب جیت جائے گا؟" صفدر شاہ نے سوال کیا۔

" مجھے کوئی شک نہیں کہ محترمہ کی عوامی مقبولیت اور پذیرائی کے باوجود ایوب خان الیکشن جیت جائے گا۔ اُس نے جو سسٹم کھڑا کیا ہے اُس میں ایوب کے مقابلے میں کسی کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔" علی نے جواب دیا۔

"لیکن جو کچھ میجر امتیاز بتا گیا ہے اُس نے مجھے حقیقی طور پر متفکر کر دیا ہے۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کی ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے گی۔ جس کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک تو جنگوں کے نتائج غیر یقینی ہوتے ہیں۔ دوسرے جنگوں سے جتنی تباہی و بربادی ہوتی ہے قومیں کئی دہائیوں تک اُن کے اثرات سے باہر نہیں آ سکتیں۔ جنگ اور وہ بھی ہندوستان کے ساتھ ایک ایسی احمقانہ خواہش ہے جس کی کبھی تکمیل نہیں ہونی چاہیے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کون لوگ ہیں جو ایوب خان کو اس جنگ میں دھکیل رہے ہیں۔ کیا جی ایچ کیو میں بیٹھے جنرل ہندوستان کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں یا کوئی اور ایوب خان کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں گوریلا کاروائیوں سے ہندوستان کو آخری اقدام اٹھانے پر آمادہ کرے۔"

صفدر شاہ نے سوال کیا۔

" میں نے سنا ہے کہ اس کا کوئی نوعمر ناتجربہ کار وزیر خارجہ ہے جس کا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے جو کشمیر میں گوریلا کاروائیوں کے منصوبے کے پیچھے ہے۔" زرینہ نے صفدر شاہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"زری جان تمھیں کہاں سے پتہ چلا کہ ذوالفقار علی بھٹو کشمیر میں گوریلا کاروائیوں کے منصوبے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔" علی نے زرینہ سے سوال کیا۔

"مجھے ماموں فیض سے پتہ چلا تھا۔ اُنہوں نے کینٹ میں فوجی افسروں کی کسی پارٹی میں شمولیت کی تھی جہاں فوجی افسروں کو اُنہوں نے باہمی گفتگو کرتے سنا تھا۔ ماموں فیض بھی تمہاری طرح اس بات پر بہت پریشان ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے کئی لیڈروں سے رابطہ کر کے اُنہیں کہا ہے کہ وہ بھٹو کو روکیں۔ ورنہ ان کاروائیوں سے ہندوستان اور پاکستان میں ایک ایسی رسہ کشی کا آغاز ہو گا جو کسی کے روکے نہیں رُکے گی۔ اور ہو سکتا ہے اس کے نتیجے میں پاکستان کو نقصان اُٹھانا پڑے۔ پاکستان ہندوستان کے مقابلے میں بہر حال ایک چھوٹا ملک ہے اور اِسی تناسب سے اِس کے وسائل بھی کم ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہمیں پہلے چوہدری فیض سے مل کر باقاعدہ ایک طریق کار طے کرنا ہو گا کہ کس طرح ایوب خان کو سمجھایا جائے کہ وہ بھٹو کے چکر میں نہ آئے اور ہندوستان کے خلاف کشمیر میں گوریلا سرگرمیاں بند کر دے۔" علی نے زرینہ کی بات آگے بڑھائی۔

"علی دعوت ایوب خان کی طرف سے ملی ہے۔ ظاہر ہے اس کا اپنا کوئی ایجنڈا ہو گا جس پر بات کرنے کے لیے وہ تمہیں ملنا چاہتا ہے۔ اگر ہم مقبوضہ کشمیر میں گوریلا سرگرمیوں کی بات کریں گے تو وہ ہماری بات ضرور سنے گا لیکن کرے گا وہی جو اس کا چہیتا وزیر بھٹو کہے گا یا اُس کے جنرل کہیں گے۔" زرینہ نے گفتگو میں ایک نیا نقطہ اٹھایا۔

"پاکستان کے فیصلوں پر ہمارا اختیار نہیں۔ لیکن جو لوگ پاکستان کی تقدیر کے فیصلے کر رہے ہیں اگر ان تک کسی طرح ہماری رائے پہنچ سکتی ہے تو ہمیں اِس سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ کم از کم ہمارا ضمیر تو مطمئن

رہے گا کہ ہم نے جو صحیح سمجھا بروقت حکمرانوں کو اُس کا انتباہ کر دیا۔" علی نے زرینہ کے جواب میں وضاحت کی۔

"اگر یہ بات ہے تو ایوب خان کو جواب بھجوادیں کہ ہم فی الحال محترمہ کی انتخابی مہم میں مصروف ہیں۔ الیکشن کے بعد کی کوئی تاریخ وہ ملاقات کے لیے ہمارے لیے بچا رکھے تو ہم اس سے ملاقات بھی کریں گے اور اُسے کامیابی کی مبارک باد بھی پیش کریں گے۔"

زرینہ نے حتمی انداز میں رائے دیتے ہوئے جس طرح "کامیابی کی مبارک باد" کے الفاظ چبا کر ادا کئے اس سے علی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

کشمیر میں گوریلا کاروائیوں کی اطلاعات سے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ محترمہ کی راہنمائی میں جمہوری قوتیں الیکشن جیت کر پاکستان کو اس پر خطر راستے پر جانے سے روکتیں۔ لیکن حکومت کے اندرونی حلقوں سے ملنے والی خبروں سے علی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ ایوب خان نے الیکشن جیتنے کے لیے ناقابل شکست منصوبہ بنالیا ہے اور اس کے الیکشن ہارنے کے امکانات تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔

عوامی خواہشات کے برعکس ایوب خان کے ہیرا پھیری سے الیکشن جیتنے کے اِن منصوبوں کی اطلاعات سے بھی علی خاصا پریشان تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں عوام کا جو موڈ دیکھ آیا تھا اُسے بخوبی اندازہ تھا کہ اِس کے نتائج پاکستان کے لیے ٹھیک نہیں نکلیں گے۔ بنگالی پہلے ہی مغربی پاکستانیوں کے رویئے سے نالاں تھے۔ انتخابی مہم کے درمیان شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری سے بھی لوگوں میں کافی غصہ پایا جاتا تھا۔ اب اگر ایوب خان نے ہیرا پھیری سے عوامی خواہشات کے خلاف الیکشن جیت لیئے تو مشرقی پاکستان میں اس کا شدید ردِ عمل ہو گا۔

علی چاہتا تھا کہ پاکستان کو کسی نہ کسی طرح کشمیر میں مہم جوئی سے روکے اور الیکشنوں کو زیادہ سے زیادہ شفاف اور قابلِ اعتبار نظر آنے کے لیے کچھ کرے لیکن کیا کرے اِس ضمن میں اُس کے ذہن میں کوئی واضح حل نہیں تھا۔

اُس نے زرینہ اور دوستوں سے اِس بارے میں پوچھا تو سب کی مختلف رائے تھی۔ اظہر کا مشورہ تھا کہ ایوب خان سے الیکشنوں کے بعد ملنے کی بجائے پہلے مل کر دونوں نقاط اُس کے ساتھ اٹھائے جائیں۔
زرینہ، صفدر شاہ اور سلیم موٹے کا خیال تھا کہ محترمہ اس سلسلے میں بیان جاری کریں۔ اور ایوب خان کو ان دونوں مسئلوں پر وارننگ دیں۔
علی نے کہا ایوب سے الیکشنوں سے پہلے ملاقات کی بجائے بذریعہ پریس محترمہ کی طرف سے وارننگ زیادہ بااثر ہو سکتی ہے۔ کل محترمہ لاہور پہنچیں گی تو وہاں پریس کانفرنس کریں گے۔ علی اور محترمہ دونوں پریس کانفرنس کے ذریعے عوام تک اپنے خدشات پہنچائیں گے اور ساتھ ہی حکمرانوں کو بھی وارننگ جاری کریں گے کہ وہ کشمیر میں گوریلا کاروایاں روکیں اور الیکشنوں کو شفاف اور قابلِ اعتبار بنانے کے لیے اقدامات کریں۔

فصل 38

سردیوں کا ٹھنڈا سورج آسمان پر ایک تہائی منزل طے کر چکا تھا لیکن فضا میں ابھی خنکی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح، علی، زرینہ اور علی کے دوست پریس کلب میں موجود تھے۔ لاہور سے شائع ہونے والے سارے اخباروں کے مدیران موجود تھے۔ سبھی اخباروں کے چھوٹے موٹے رپورٹر بھی آئے بیٹھے تھے۔ تقریباً تمام جانے پہچانے کالم نگار بھی موجود تھے۔

علی نے پریس کانفرنس کا آغاز کرتے ہوے کہا: "وہ اور محترمہ فاطمہ جناح ابھی مشرقی پاکستان میں انتخابی مہم سے واپس لوٹے ہیں۔

محترمہ کو مشرقی پاکستان کے تمام اہم شہروں میں اپنی مہم میں جو پذیرائی ملی قائد اعظم کے بعد شاید ہی کسی اور سیاست دان کو ملی ہو۔

اس پذیرائی کی محض ایک وجہ تھی۔ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے بہت شکایات ہیں۔ ان شکایات کی تفصیل میں جائے بغیر میں یہ کہوں گا کہ محترمہ فاطمہ جناح اُن کی آخری اُمید ہیں۔ اُنہیں توقع ہے کہ محترمہ الیکشن جیت کر ملک میں سیاسی عمل بحال کریں گی۔ ان کی شکایات کا ازالہ کریں گی اور ملک کے دونوں حصوں کو آزادانہ جمہوری ماحول میں تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن کریں گی۔

یہاں آکر ہمیں بارسوخ ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ ایوب خان نے محترمہ کو ناکام کرنے کی حکمتِ عملی طے کر لی ہے۔ ملک بھر کے بنیادی جمہوریت کے تحت قائم ہونے والی کمیٹیوں کے ممبران کو واضح طور پر ہدایات دے دی گئی ہیں کہ اُنہوں نے ایوب کو ووٹ دے کر کامیاب بنانا ہے۔ ایسا نہ کرنے کی شکل میں اُنہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔

مشرقی پاکستان میں مجھے یہ تاثر ملا ہے کہ اگر ایوب خان کی طرف سے الیکشنوں میں اس طرح کی ہیرا پھیری کی گئی تو مشرقی پاکستان میں اِس کا شدید ردِ عمل ہو گا۔ یہ ردِ عمل مغربی پاکستان سے علیحدگی کی شکل میں بھی رونما ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مشرقی پاکستان سے واپسی کے بعد ہمیں پاک فوج کے اندرونی ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ پاک فوج نے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے کچھ قریبی جرنیلوں کے کہنے میں آکر کشمیر میں گوریلا کاروائیاں شروع کر رکھی ہیں۔

کشمیر کے عوام کے لیے یو این او کی قرادادوں کی روشنی میں کشمیر کے مستقبل کے بارے میں حقِ رائے دہی پر عمل ہمارے دل کی آواز ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کشمیر کے عوام کو ان کا یہ حق ملے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ گوریلا کاروائیوں سے نہ صرف کشمیری عوام کے اِس حق کے امکانات معدوم ہوتے جائیں گے بلکہ اِس سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کھلی جنگ ہو سکتی ہے جو کسی بھی طرح پاکستان کے مفاد میں نہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ایوب خان کشمیر میں ایسی کاروائیاں فوراًروک دیں اور الیکشن کے بعد یہ بات منتخب قیادت پر چھوڑ دی جاے کہ وہ کس طرح کشمیر کے مسئلے پر پیش رفت کرنا چاہتی ہے۔

آپ کو یہاں آنے کی زحمت دینے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اہم باتیں آپ کے ذریعے پاکستان کے عوام اور اُن لوگوں تک پہنچادی جائیں جو پاکستان کی قسمت کے دن رات فیصلے کرتے ہیں۔"

محترمہ نے علی کی باتوں کی تائید کرتے ہوے کہا: "علی نے تمام اہم باتیں بہت اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دی ہیں۔

میں آپ کے توسط سے ایوب خان کو وارننگ دینا چاہتی ہوں کہ وہ الیکشن کے نتائج کو مصنوعی طریقوں سے تبدیل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اِس سلسے میں اندرونِ خانہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیئے جارہے ہیں اُس پر ہمیں خاصی تشویش ہے۔ اگر انتظامیہ نے یہ روش تبدیل نہ کی اور الیکشن کے جعلی نتائج گھڑنے کی کوشش کی گئی تو ہم مغربی اور مشرقی پاکستان میں بھرپور احتجاجی مہم چلائیں گے اور عوامی طاقت سے ایوب خان کے نظام کا خاتمہ کر دیں گے۔

کشمیر میں گوریلا کاروائیوں کے بارے میں علی نے جتنی باتیں کی ہیں میں ان کی من وعن تائید کرتی ہوں۔ میرا ایوب خان کو مشورہ ہے کہ وہ ایسا خطرناک کھیل نہ کھیلیں جس سے پاکستان کی سالمیت داؤ پر لگ جائے۔

ہمیں پاکستان کی تعمیر وترقی کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ لوگوں کو اُن خوابوں کی تعبیر مل سکے جن کے لیے اُنہوں نے قائداعظم کی راہنمائی میں جدوجہد کی تھی۔

ہم نے مشرقی پاکستان میں واضح طور پر دیکھا کہ لوگ پاکستان میں ایک ایسا سیاسی نظام دیکھنا چاہتے ہیں جو عدل وانصاف کے اصولوں پر مبنی ہو۔ جس میں اُن کے احساسات کی ترجمانی ہوتی ہو۔ جو اُن کے طرزِ زندگی اور نظریات کی عکاسی کرتا ہو۔

مغربی پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں سے بھی ہمیں اِسی طرح کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ کل ہم جی ٹی روڈ کے ذریعے پشاور جائیں گے اور راستے میں جگہ جگہ قائم کیئے گیئے استقبالیہ کیمپوں میں اکٹھے ہونے والے سیاسی کارکنوں سے ملاقات کریں گے اور عوام تک اپنی بات پہنچائیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں پُرامن طریقے سے سیاسی تبدیلی آئے۔ امن و امان کی خرابی سے عوام کے لیے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ عوام کو دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے۔

محترمہ کے مختصر بیان کے بعد پریس کلب میں آئے بیٹھے سب مدیران نے محترمہ کا شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے پاکستان میں جمہوری قافلے کی سالار بننا قبول کیا۔

اِس کے بعد اُنھوں نے ایوب خان کے پریس کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات کے خلاف شکایات کے ڈھیر لگا دیئے۔

اُن کے جواب میں محترمہ نے اُنہیں یاد دلایا کہ قائد اعظم آزاد میڈیا کے کتنے زبردست حامی تھے اور کس طرح اُنھوں نے سیاست میں آنے کے بعد میڈیا کی آبیاری کی تھی۔

انھوں نے مدیران کو یقین دلایا کہ اگر وہ الیکشن جیت گئیں تو وہ میڈیا کی آزادی کے لیے قائد اعظم کے اصولوں پر کاربند رہیں گی۔ اور ایسا ماحول بنائیں گی کہ پاکستان کے عوام کو زیادہ سے زیادہ قومی معاملات کے بارے میں باخبر رکھا جاسکے اور اہم معاملات پر اُن سے راہنمائی لی جائے۔

تاہم کشمیر کے مسئلے پر اکثر مدیروں، رپورٹروں اور کالم نگاروں کا خیال تھا کہ اِس بات کے امکانات موجود تھے کہ کشمیر کے مسئلے پر پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جائے۔ اور اِس کی وجہ پاکستان کی کشمیر میں گوریلا کاروائیوں کی بجائے ہندوستان کے کشمیر کے مسئلے کے حل میں تاخیری حربے ہوں۔

اُن کا کہنا تھا اگر ہندوستان نے یواین او میں اتفاق کیا تھا کہ وہ کشمیر میں استصواب رائے کے ذریعے کشمیریوں سے فیصلہ لے گا تو اُسے اِس میں تاخیری حربے استعمال نہیں کرنے چاہیں اور جلد سے جلد ایسے استصواب رائے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ پاکستان اور ہندوستان دو اچھے ہمسائیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔

محترمہ نے اخباری نمائندوں سے اتفاق کیا لیکن ساتھ ہی کہا کہ گوریلا کاروائیوں سے استصواب رائے میں مزید تاخیر ہونے کے امکانات ہیں۔ اور ہندوستان کو موقع ملے گا کہ وہ ایسی کاروائیوں کو بہانہ بنا کر استصواب رائے کو غیر معینہ مدت تک موخر کر دے۔

اِس کے بعد کئی رپورٹروں نے محترمہ سے پوچھا کہ ایوب خان ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ وہ الیکشن جیت جائے گا کیونکہ گزشتہ چار پانچ سالوں میں اُس نے پاکستان میں زرعی اور صنعتی شعبوں میں ترقی کی جو بنیاد رکھی ہے اِس کے اثرات واضح طور پر عوام کو دکھائی دے رہے ہیں۔

کسانوں کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ مُلک میں نئی صنعتیں لگ رہی ہیں۔ مزدوروں کو روزگار مل رہا ہے۔ ملک میں ڈیم بن رہے ہیں۔ زراعت کے لیے پانی کے نئے وسائل فراہم کئے جا رہے ہیں۔ سڑکیں بن رہی ہیں۔ ٹرانسپورٹ سسٹم بہتر ہو رہا ہے۔ لوگوں کے لیے سفر کرنے کی سہولتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اُن کے جواب میں محترمہ نے کہا۔ ایوب جو بھی کہتا ہے کہتا رہے۔ عوام ہمارے ساتھ ہیں۔ الیکشن میں فیصلہ عوام نے کرنا ہے۔ جہاں تک زرعی اور صنعتی ترقی کا تعلق ہے جمہوریت اور زرعی اور صنعتی ترقی میں کوئی اختلاف نہیں۔

آپ ڈکٹیٹر شپ میں ترقی کریں گے تو آپ کو اُس کی قیمت بھی چکانا پڑے گی۔ مُلک میں معاشی ناہمواری میں اضافہ ہو گا۔ عوام کی عدمِ شمولیت کی وجہ سے سماجی انصاف کے ادارے کمزور ہوں گے۔ عوام میں بے چینی بڑھے گی جس سے مُلک میں سیاسی بحران جنم لیں گے اور آخر کار ظاہری ترقی کے باوجود ملک تنزل کی طرف چل نکلے گا جس سے ساری ترقی دھری کی دھری رہ جائے گی۔

ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ترقی ہو لیکن یہ ترقی جمہوری قوتوں کی راہنمائی میں ہونی چاہیئے۔ تا کہ لوگ اِس ترقی کے عمل میں خود کو شامل سمجھیں اور اس پر فخر کا اظہار کر سکیں۔ اور اسے اپنی محنتوں کا ثمر قرار دے سکیں۔

ڈھائی تین گھنٹے تک میڈیئے کے ساتھ تبادلہء خیال کے بعد علی نے پریس کانفرنس کے اختتام کا اعلان کیا تو سب خوش تھے کہ کل کے اخبارات میں سب کی تصاویر چھپیں گی اور محترمہ کی پریس کانفرنس کی تفصیلات نمایاں انداز میں شائع ہوں گی۔

لیکن اگلے دن سب اخبارات کے کالموں پر جگہ جگہ سیاہی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صرف محترمہ اور علی کی ایک تصویر چھپی تھی جس میں ان کی مشترکہ پریس کانفرنس کی دوسطری خبر تھی۔ لیکن تفصیلات والے کالموں کو سیاہی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

فصل 39

انتخابی مہم کے آخری حصے کے لیے محترمہ کا قافلہ لاہور سے پشاور جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ پولیس کی گاڑیوں کی معیت میں ایک پاکستانی جھنڈے والی سیاہ گاڑی علی کی رہائش گاہ پر آ کر رُکی۔ محترمہ ابھی تک اپنے کمرے میں تھیں۔ علی، زرینہ اور ان کے دوست ڈرائنگ روم میں بیٹھے اگلے چند دنوں کی اسٹریٹیجی پر غور کر رہے تھے۔

سیکورٹی گارڈ نے آ کر بتایا کہ باہر پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو تشریف لائے ہیں اور علی حسین سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ علی نے سیکورٹی گارڈ سے کہا وہ اُنہیں ادب سے اندر لے آئے۔ بھٹو صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو علی اور زرینہ نے اُنہیں پُر تپاک طریقے سے خوش آمدید کہا۔

بھٹو صاحب نے علی اور اس کے دوستوں کے ساتھ فرداً فرداً ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگے وہ علی سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ علی نے کہا وہ انجمن کو خلوت ہی سمجھیں کیونکہ وہاں سب لوگ افرادِ خانہ ہیں۔ اور ویسے بھی وہ سب سیاسی ملاقاتیں زرینہ اور اپنے دوستوں کی موجودگی میں کرتا ہے۔

بھٹو صاحب نے بغیر کسی تمہید کے علی سے کہا کہ جی ایچ کیو علی کی کل کی پریس کانفرنس سے سخت ناراض ہے۔ اور وہ جی ایچ کیو کی طرف سے اُسے وارننگ دینے آئے ہیں کہ وہ کشمیر پالیسی کے بارے میں بیان دینے سے گریز کرے کیونکہ اُس کے بیانات پاکستان کے مفاد کے منافی ہیں اور اُن سے جی ایچ کیو کی کشمیر کے حل کی پالیسی مجروح ہونے کے امکانات ہیں۔

علی اور زرینہ نے بھٹو صاحب کی بات انتہائی تحمل سے سنی۔ اِس سے پہلے کہ علی بھٹو صاحب کو کوئی جواب دیتا زرینہ نے دیوار پر لٹکتی گن اٹھا کر کھڑکی میں کھڑے ہو کر آسمان پر اُڑتی مرغابیوں پر فائر کیا۔ چار پانچ مرغابیاں دھڑم سے بیرونی لان میں آن گرئیں۔ پھر بھٹو صاحب سے معذرت کرتے ہوئے بولی اُس نے

بہت دیر سے مرغابیوں کا شکار نہیں کیا تھا۔ اُسے آسمان پر مرغابیوں کی اڑتی ہوئی قطار دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ دیکھے ابھی تک اُس کا نشانہ کہاں تک درست ہے۔ بھٹو صاحب ابھی تک زرینہ کے گن اٹھانے سے سہمے بیٹھے تھے مسکراتے ہوئے بولے کہ نشانہ اُن کا بھی بُرا نہیں لیکن جس پھرتی اور چابکدستی سے زرینہ نے گن اٹھا کر کھڑکی میں کھڑے ہو کر اڑتی مرغابیاں گرائی ہیں اس کا جواب نہیں۔

علی نے محبت سے زرینہ کی طرف دیکھا اور پھر بھٹو صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا:

"آپ نے جی ایچ کیو کی جس کشمیر پالیسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ جی ایچ کیو کی نہیں ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسی ہے جسے اُنہوں نے اپنے چند حمائتی جرنیلوں کے ساتھ مل کر مرتب کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو کشمیر کا مسئلہ کامیاب ڈپلومیسی کے ذریعے مناسب وقت پر حل کرنا چاہیے۔

کشمیر میں گوریلا کاروائیوں سے آپ جس کھیل کا آغاز کرنے جارہے ہیں وہ پاکستان کو بہت مہنگا پڑے گا۔ اس پالیسی کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے گی بلکہ اِس سے خطے میں ایسی فضا جنم لے گی جس میں کوئی ملک امن چین سے نہیں رہ سکے گا۔ پاکستان کے لیے اِس پالیسی کے زیادہ خطرناک نتائج نکلیں گے کیونکہ پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے۔ اِس کے وسائل کم ہیں۔ ہندوستان زیادہ بہتر پوزیشن میں ہے اور وہ زیادہ طویل عرصے تک جنگ لڑ سکتا ہے جبکہ پاکستان کے لیے طویل جنگ لڑنا ملڑی اور مالی طور پر ممکن نہیں ہو گا۔"

ذوالفقار علی بھٹو علی سے ایسے جواب کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جی ایچ کیو کی ناراضگی کے ذکر سے علی کشمیر پر اپنی بیان بازی روکنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی مختلف تھا پہلے اُس کی بیگم نے آسمان پر اڑتی مرغابیاں گرا کر ایک پیغام دیا تھا اور اب علی جس دوٹوک انداز میں بات کر رہا تھا لگتا نہیں تھا کہ اُس کو روکنا ممکن ہو گا۔ چنانچہ اُنہوں نے پینترا بدلتے ہوئے علی سے کہا: "ایک تو وہ جنگی حکمت عملی سے کشمیر کا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا ملک میں جمہوریت واپس لانا چاہتے ہیں۔ اور علی کو چاہیئے کہ وہ اُن کی مدد کرے۔"

علی نے کہا: "بھٹو صاحب بات وہ نہیں جو آپ کر رہے ہیں۔ آپ کا اپنا ایک سیاسی ایجنڈہ ہے۔۔ آپ بیک وقت دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کو ساتھ ملا کر پاکستان پر قابض ہونا چاہتے۔ کشمیر پر جارحانہ پالیسی سے آپ دائیں بازو کی قوتوں کو ساتھ ملانا چاہتے ہیں اور چین کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کا جھانسہ دے کر بائیں بازو کی قوتوں کو تاثر دینا چاہتے ہیں کہ آپ ترقی پسند ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے پاکستان کی سالمیت کو داو پر لگانا چاہتے ہیں۔ ہمیں ایوب خان سے کوئی ہمدردی نہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُنہوں نے آپ کی سرپرستی کرکے ایک ایسی غلطی کی ہے جس کی وجہ سے انہیں اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

علی کی صاف گوئی پر بھٹو صاحب نے بھی چرب زبانی سے کام لیتے ہوے جواباً کہا: "آپ محترمہ کی آڑ میں کیا ایوب خان کے اقتدار کو طوالت دینے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

علی نے بھی ترکی بہ ترکی بھٹو صاحب کو جواب دیا: "میں نے اپنے علاقے میں جو کیا ہے۔ آپ بھی اپنے علاقے میں وہ کرکے دکھائیں پھر جمہوریت پسندی اور ترقی پسندی کی بات کریں۔ محترمہ بانی پاکستان کی بہن ہیں۔ ہم سیاسی انداز سے ملک میں سیاسی تبدیلی کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی دشمنی کی بنیاد رکھ کر پاکستان کے ساتھ سازش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے کئی جرنیلوں اور سول افسروں کو گمراہ کیا ہے۔ جو ایوب خان کی اجازت کے بغیر ایسی بے بنیاد جعلی خبریں پھیلا رہے ہیں جس سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خراب ہوں۔ دونوں ملک جنگ کریں۔ اور پاکستان میں ایسا خلفشار پیدا ہو جس سے آپ اقتدار پر قبضہ کر سکیں۔"

علی اور ذوالفقار علی بھٹو کی گفتگو چل رہی تھی کہ محترمہ تیار ہو کر چلی آئیں۔ بھٹو صاحب نے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوے چہرے کے ساتھ محترمہ کو سلام پیش کیا۔

محترمہ نے بھٹو سے پوچھا کہ وہ خود وہاں آئے ہیں یا ایوب خان نے انہیں کسی خاص مقصد کے لیے بھیجا ہے؟

بھٹو نے کہا وہ چند جرنیلوں کا انتباہ لے کر علی کو ملنے آئے ہیں۔ زرینہ نے لقمہ دیتے ہوئے کہا یہ جرنیلوں کا نہیں بھٹو صاحب کا اپنا انتباہ ہے۔ جس کی وضاحت علی نے بڑی اچھی طرح بھٹو صاحب کے لیے کر دی ہے۔

محترمہ نے بھٹو سے مخاطب ہوتے ہوے کہا کہ وزارت اطلاعات نے ان کی پریس کانفرنس کی تفصیلات شائع نہیں ہونے دی۔

بھٹو صاحب نے کہا ہاں الطاف گوہر نے مجھے بتایا تھا کہ علی اور آپ نے کچھ ایسی باتیں کی ہیں جو پاکستان کی دفاعی پالیسی میں فٹ نہیں ہوتی تھیں اس وجہ سے اُنہیں روکنا پڑا۔

محترمہ نے بھٹو کو وارننگ دیتے ہوے کہا: "ایوب خان پاکستان کے دفاع کے نام پر جو کچھ کر رہا ہے اُس سے پاکستان کمزور ہو گا۔ پاکستان کی اکائیوں میں نفرت اور بداعتمادی بڑھے گی۔ یہ پاکستان کا دفاع نہیں۔ یہ ایوب خان کا اپنا دفاع ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ایوب خان کے کان چند جرنیلوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ان جرنیلوں سے آپ کی دوستی ہے۔ جو کچھ آپ ایوب خان کو کہتے ہیں وہ بھی وہی باتیں ایوب خان کے ذہن میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اس طرح ایوب خان کو آپ اور آپ کے ساتھی جنرل مل کر گمراہ کر رہے ہیں۔ "

علی نے محترمہ کی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوے کہا: "جس طرح بھٹو صاحب آپ دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کر رہے ہیں اسی طرح چند فوجی جرنیلوں اور نوکر شاہی کی افسروں کو بھی آپ نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اس لائحہ عمل سے پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات تو خراب ہوں گے ہی لیکن پاکستانی معاشرے کے اندر ایسی تقسیم واقع ہو گی جس کے بعد یہ ملک کبھی سماجی استحکام حاصل نہیں کر سکے گا۔"

بھٹو صاحب نے اس اعتراض پر خشمگیں نگاہوں سے علی کی طرف دیکھا اور پھر خود پر قابو رکھتے ہوے بولے: " اب یہ پاکستانی معاشرے کو تقسیم کرنے کا الزام مجھ پر کیوں لگایا جارہا ہے ؟"

"اگر ایسا نہیں تو پھر یہ کشمیر میں گوریلا کاروائیوں اور جنگ کے نعروں سے کس کو خوش کیا جارہا ہے۔ اور چین دوستی کے حوالے سے کن کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھائی جارہی ہیں۔ ایک طرف آپ کشمیر کے نام پر دائیں بازو کے انتہا پسندوں کو اُکسا رہے ہیں تو دوسری طرف بائیں بازو کے لوگوں کو چین دوستی کے ذریعے پیغام دے رہے ہیں کہ وہ چینی اشتراکیت میں اپنے مسائل کا حل ڈھونڈیں۔ آگے چل کر آپ امیر غریب کی، مزدور اور سرمایہ دار کی، اور کسان اور زمین دار کی، تقسیم کریں گے اور یوں پاکستان کو ایک ایسے جہنم میں جھونکیں گے جس سے یہ کبھی باہر نہیں آسکے گا۔ اور اس طرح کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے گا۔" علی کی آواز میں تھوڑی سی برہمی آرہی تھی۔

" اگر دائیں بازو کو متحرک کر کے کشمیر آزاد ہوتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟" بھٹو صاحب نے نکتہ اُٹھایا۔

"برائی ہے۔ اور برائی یہ ہے کہ یہ لوگ نظریہ پاکستان کو پاکستان پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان جائے جہنم میں صرف نظریہ پاکستان زندہ رہنا چاہیے۔ لیکن یہ لوگ یہ نہیں بتاتے اگر پاکستان جہنم میں چلا گیا تو پھر نظریہ پاکستان کس شاخ پر گھونسلہ بنائے گا؟ اس لیے آپ سیدھے سبھاؤ پاکستان میں ایک صحت مند اور صاف ستھری سیاست کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں تاکہ پاکستان ایک نارمل ریاست کے طور پر تعمیر و ترقی کی منازل طے کر سکے۔" علی نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

بھٹو صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ علی ہرگز ان جوانوں میں سے نہیں جو ان کی منطق کے سحر میں گرفتار ہو گا۔ اور ان کی معاشرے اور اداروں کو تقسیم در تقسیم کرنے کی سیاست میں حصہ دار بنے گا۔

اکٹھے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے انہوں نے محترمہ سے اجازت چاہی اور علی اور زرینہ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ علی کے پاس جی ایچ کیو کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ پیغام اُنہوں نے علی تک پہنچا دیا ہے۔ اِس کے بعد جی ایچ کیو جانے اور علی۔

اس کے بعد وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنی مطلوبہ منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور محترمہ کا قافلہ جی ٹی

روڈ کے ذریعے پشاور کی طرف چل پڑا۔

فصل 40

مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان میں محترمہ جہاں بھی انتخابی مہم کے سلسے میں گئیں اُنہیں عوام میں بھرپور پذیرائی ملی۔ لاہور سے پشاور تک جی ٹی روڈ پر محترمہ کے قافلے کا سفر کئی دن میں طے ہوا۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں محترمہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے عوام نے استقبالیہ کیمپ لگائے۔

علی کے لیے مشرقی پاکستان میں ہونے والے عوامی رابطے کے تجربے کے بعد مغربی پاکستان میں اِس سطح کا پہلا تجربہ تھا۔ ذاتی طور پر اُس کی ملاقات قومی سطح کے راہنماوں سے گاہے بگاہے کہیں نہ کہیں ہوتی رہتی تھی جس کے نتیجے میں اُسے پاکستان کی قیادت کے ذہنی رجحانات اور صلاحیتوں کا کافی اندازہ تھا۔

اُس کا دل اس بات سے دکھی ہونے لگا تھا کہ پاکستان میں کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جو پاکستان کو اے کلاس ریاست بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ سب دوسرے تیسرے درجے کی شخصیتوں کے مالک تھے جو اپنے وسائل یا گٹھ جوڑ کی وجہ سے لیڈر بنے بیٹھے تھے۔

اُس کے علاقے میں اُس کی اصلاحات سے جو تبدیلیاں آرہی تھیں اور وہاں عوام کا جس طرح معیار زندگی بلند ہونے لگا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی ساری قیادت میں اسے شعور کی ایسی کوئی کرن کسی جگہ دکھائی نہ دی جو پورے پاکستان میں ایسی تبدیلیاں لا سکتی۔

اُس کے نزدیک ایک سچے قائد کی یہ پہچان تھی کہ وہ اپنے عوام کا معیار زندگی دنیا میں سب ملکوں سے بہتر بنائے۔ اُن کے شہر نہ صرف سماجی تنظیم کے بہتریں شاہکار ہوں بلکہ تعمیراتی آرٹ کا بہترین نمونہ بھی ہوں۔ باقی دنیا کے لوگ ان کی کاپی کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح لوگوں کے رہنے سہنے کے گھر ایسی جدید سہولتوں سے آراستہ ہوں کہ ملک کے شہری اپنے خاندانوں کے ساتھ ان میں آسودگی سے اپنی زندگیاں گزاریں اور اپنی آئندہ نسلوں کی پرورش کریں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسے اسکول اور ادارے ہوں جہاں اُن کی تعلیم و تربیت کا انتظام دنیا کے سب ملکوں سے بہتر ہو۔ جہاں اُن کی ظاہری اور باطنی شخصیتوں کی اس طرح نشو و نما ہو کہ وہ بہترین اور قابل ترین انسان بن سکیں۔

وہ اکثر سوچتا کیا یہ سب کچھ کرنا ناممکن ہے۔ پھر اس کی سوچ پاکستانی قیادت کی طرف چلی جاتی۔ اِن لیڈروں کے ہوتے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ غلام ابن غلام کی سوچ رکھنے والے حکمران کس طرح ایک آزاد قوم کی تربیت کر سکتے ہیں۔ غلامی کی سوچ اگر افراد میں آجائے تو وہ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا ستیاناس نہیں سوا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ اقوام میں آجائے تو وہ کبھی ذلت کی سطح سے اُوپر نہیں اٹھ سکتیں۔

غلامی اعلیٰ انسانی قدروں کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اور یہ غلامی چاہے انسان کی ہو یا خدا کی انسانوں اور قوموں کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور اسے وہ سب صلاحیتیں عطا کی ہیں جن کے بل بوتے پر وہ واقعتاً ستاروں پہ کمندیں ڈال سکتا ہے۔

لیکن انسانوں کو غلام بنانے والی قوتیں پوری کوشش کرتی ہیں کہ انسان کبھی آزاد نہ ہونے پائے۔ یہ کوششیں کہیں عقیدے کے نام پر ہوتی ہیں۔ کہیں نسل پرستی کے نام پر اور کہیں وطن پرستی کے نام پر۔ علی تو عشق میں بھی غلامی کے خلاف تھا۔ عشق چاہے مرد کا ہو یا عورت کا یا کسی ماورائی ہستی کا۔ اگر غلامی سکھائے تو خللِ دماغ اگر آزادی عطا کرے تو روشن چراغ، عینِ رحمت اور عینِ مدعائے آفرینشِ انسانیت۔

مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان میں بھی علی محترمہ کے قافلے کے ساتھ جہاں جہاں جا رہا تھا اُسے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ غلاموں کا ایک جمِ غفیر تھا جو پورے پاکستان میں پھیلا تھا۔ اور غلام بھی ایسے جو کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر حالت میں تھے۔ جنھوں نے ایسے گھٹیا حکمرانوں کو حقِ حکمرانیت عطا کر رکھا ہے جو قومی معاملات چلانا تو دور کی بات ہے وہ اپنے ذاتی معاملات چلانے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔

وہ سوچتا غلاموں کے اس جم غفیر سے تو شہد کی کارکن مکھیاں بہتر ہیں جو اپنی ملکہ کو اس وقت ہلاک کر دیتی ہیں جب وہ پیداوار کی صلاحیت کھو دیتی ہے۔ اور یہاں غلاموں کا یہ جم غفیر ہے جو ہر سطح پر ہر وقت کسی نہ کسی کو پال رہا ہے اور اس کے ہاتھوں ذلیل بھی ہو رہا ہے۔

انہی سوچوں کے بہاؤ میں اس نے ہر جگہ لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قائد اعظم نے 1947 میں اُنہیں انگریز کی قید سے رہائی دلائی تھی لیکن پاکستان میں ہر سطح پر بیٹھے آقاوں سے نجات اُنہیں خود پانی ہو گی۔

قائد اعظم اور اُن کی نسل کو جو چیلنج درپیش تھا اُنہوں نے اپنے حالات اور معروضی حقائق کے مطابق اِس کا بہترین حل نکالا۔ ہمیں ایک عظیم خطہ زمین لے کر دیا جس کے وسائل اور حسن میں دنیا کا کوئی اور ملک مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم افرادی اور قومی سطح پر اُن سب غلامیوں سے نجات پائیں جنہوں نے ہم سب کے گلوں کو دبا رکھا ہے۔ یہ غلامی کہیں مولوی کی شکل میں ہے جس کی اپنی زندگی ہمارے چندوں سے چلتی ہے حالانکہ ہمارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی اُجرتی مولوی ہماری نمازوں میں امام بنے۔ کہیں اس کم نگاہ، ڈرپوک استاد کی شکل میں ہے جو ہماری شخصیتوں کو نکھارنے کی بجائے اپنی ساری صلاحیتیں اس غلامانہ نظام کا کارندہ بنانے پر صرف کر دیتا ہے۔ کہیں اُس جاگیردار یا زمیندار کی شکل میں ہے جسے یہ تو پتہ نہیں کہ مرنے کے بعد اُسے دفن ہونے کے لیے چھ فٹ زمیں ملے گی یا نہیں لیکن وہ سمجھتا ہے کہ وہ سینکڑوں ہزاروں ایکڑوں کا مالک ہے اور اس کے علاقے میں رہنے والے انسان اُس کے زرخرید نسلی غلام ہیں۔ کہیں ان جرنیلوں کی شکل میں ہے جو وہ کام نہیں کرتے جس کے لیے اُنہیں بھرتی کیا جاتا ہے اور ملک پر قبضہ کر کے کروڑوں انسانون کی زندگیوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ایسے گھٹیا اور بے کار فیصلے کہ اُن کے ہر فیصلے کے بعد پاکستان مزید کمزور ہو جاتا ہے۔ انسانوں کے مصائب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور کروڑوں انسان زندگی کی آزادیوں سے ہمکنار ہونے کی

بجائے مزید غلامیوں کی دلدل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ غلامی کہیں اُن سیاسی چھچھوندروں کی شکل میں ہے جو خود کو سیاست دان کہتے ہیں لیکن اُن کی ساری جدوجہد برسر اقتدار آنے کے لیے ہوتی ہے حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ قوم کیا ہے اور قوموں کی قیادت کیا ہے۔ ملک کیا ہوتے ہیں اور ان کی تعمیر کیسے کی جاتی ہے۔

علی کی تقریریں لوگوں کے جوش وجذبہ کو دوچند کررہی تھیں۔ خود محترمہ علی کے جوش خطابت سے مسحور ہونے لگی تھیں اور کہیں کہیں اپنے انتخابی موضوعات سے ہٹ کر علی کے اُٹھائے ہوئے نقاط کو اپنی تقریروں کا حصہ بنارہی تھیں۔

محترمہ نے پشاور میں اپنی تقریر سے غفار خان کے خدائی خدمتگاروں اور نیپ کے سیاسی کارکنوں کے دل جیت لیے۔ خان صاحب کی حکومت کی برطرفی کے بعد قائداعظم کے ساتھ ان کے جتنے اختلافات پیدا ہوئے تھے محترمہ کی پشاور آمد اور ان کی تقریر کے بعد ختم ہوگئے اور اُنہوں نے محترمہ کے الیکشن میں ان کا بھرپور انداز میں ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

محترمہ فاطمہ جناح بمقابلہ ایوب خان انتخابی مہم ختم ہوئی تو علی ایک ایسی شخصیت کے طور پر قومی سطح پر روشناس ہوا جس کا زندگی کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر تھا۔ جس کی ایک واضح سیاسی سوچ تھی۔ اور جس کے پاس ایک جامع معاشی پروگرام تھا۔ اور پاکستان کے مستقبل اور پاکستانیوں کے بارے میں کچھ ایسے خواب تھے جن کی تکمیل کے لیے ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جس سے پاکستان میں عوام کی قوت اور شمولیت سے ایسی انقلابی تبدیلیاں لائی جاتیں جن کے نتیجے میں پاکستان واقعتاً دنیا کا عظیم ترین ملک بن جاتا۔ اور پاکستانی ایک ایسی قوم میں تبدیل ہوجاتے کہ حقیقی معنوں میں قوموں کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے اور دنیا کے بڑے بڑے فیصلے پاکستان کے دارالحکومت میں ہونا شروع ہوجاتے۔

کئی مہم جو جرنیلوں نے خفیہ طور پر اِس سے رابطے کئے کہ وہ اقتدار پر قابض ہونے میں اُس کی مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن اُس نے ہر رابطہ کرنے والے جنرل کو یہی جواب دیا کہ جو کام وہ کرنا چاہتا ہے وہ صرف عوام کی شمولیت اور بھرپور اعانت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کسی فوجی انقلاب کے ذریعے ایسے کام نہیں ہو سکتے۔
کئی سیاسی لیڈروں نے اُس سے رابطہ کر کے اُسے سیاسی پارٹی بنانے کا مشورہ دیا جس میں وہ اُس کے دست وبازو بن سکتے تھے لیکن اُن میں سے کسی میں اُسے وہ جوہر دکھائی نہ دیا جو اُس کے اعلی مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہوتا۔
وہ سب کاسہ لیسی کے ایسے شاہکار تھے کہ ان کی گفتگو سے علی کو گھن آتی تھی۔ زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر تو باقاعدہ ان کی چاپلوسی کی نقلیں کر کے خوش ہوتے۔ اور ان کا مذاق اُڑاتے۔ بلکہ کئی ایک کے ناموں پر اُنہوں نے اپنے جانوروں کے نام رکھے تھے۔ جیسے بار برداری کے لیے استعمال ہونے والے اپنے ایک خچر کو انہوں نے ایوب خان کا نام دے رکھا تھا۔
قائداعظم کی طرح علی کی اُمیدیں بھی پاکستان کے نوجوانوں سے وابستہ تھیں۔ وہ اکثر زرینہ سے کہتا اگر پاکستان کے نوجوان کمر کس لیں تو وہ اِس ملک کو ایسی راہ پر پر ڈال سکتے ہیں جس سے اِس ملک کا مستقبل ستاروں کی طرح درخشان ہو سکتا ہے۔
لیکن نوجوانوں کو اِس مقصد کے لیے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو اُنہیں آزادیء فکر و نظر سے مالا مال کر دے۔ اُن کی ہر ادا سے ظاہر ہو کہ وہ ایک آزاد قوم کے فرزند ہیں۔ نہ وہ اپنی تاریخ اور ماضی پر شرمسار ہوں اور نہ اپنے مستقبل کے بارے میں کسی گومگو کا شکار۔ جن کی نظریں ہمیشہ زندگی کے اعلی مقاصد پر مرکوز رہیں۔ جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں کبھی کسی "احساس گناہ" کی پرچھائیاں نہ پڑنے دیں۔ جو نیکی کریں تو اس لیے کہ نیکی کرنا ایک اچھا عمل ہے نہ کہ جنت کی لالچ میں۔ جو برائی سے بچیں تو اس لیے کہ برائی اعلی انسانی اوصاف کے منافی ہے نہ کہ جہنم کے خوف سے۔ جو پر سکون

سمندروں میں تیراکی کے لیے اتریں تو سمندروں کی وسعتیں ان کے لیے آغوشِ مادر بن جائیں اور اگر طوفانی سمندروں میں اتریں تو پر شور موجیں ان کے لیے اسپہائے تازی میں ڈھل جائیں۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں عوام سے مل کر وہ اس بات پر بھی دکھی تھا کہ لوگوں میں تبدیلی کی زبردست خواہش ہونے کے باوجود ہر دروازے پر کوئی لٹیرا دربان بیٹھا تھا جو تبدیلی کے راستے کی رکاوٹ بن جاتا تھا۔ جب بھی تبدیلی کی خواہش رکھنے والے عوام کے قدم منزل کے قریب آتے ہیں عین اس لمحے کوئی دوست نما دشمن لیڈر ان کا راستہ کھوٹا کر دیتا ہے۔ منزل پھر اُن سے کوسوں دور ہو جاتی ہے اور وہ نئے سرے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

علی جانتا تھا کہ محترمہ یہ الیکشن نہیں جیت پائیں گی۔ لیکن اسے یہ بھی پتہ تھا کہ اس الیکشن کے ساتھ پاکستان ہار جائے گا۔ اور پھر یہ ہار کہاں جا کر رُکے گی اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ نہ کسی مولوی کو، نہ کسی استاد کو، نہ کسی جنرل کو اور نہ کسی سیاست دان کو۔ اور انہیں پتہ بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ سب اتنے چھوٹے لوگ ہیں کہ گھوڑوں کی سواری تو دور کی بات ہے یہ گدھوں کی سواری کا ہنر نہیں جانتے۔

ملکوں اور قوموں کی تعمیر کے لیے جن آزاد منش عاشقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کب کے جا چکے تھے۔ اب تو پاکستانیوں کو صرف سرابوں کا سامنا تھا۔ سیاسی استحکام کے سراب، معاشی خوشحالی کے سراب، اور سچی اور کھری لیڈرشپ کے سراب جس کے آثار علی کو دور دور تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔

فصل 41

الیکشنوں کا نتیجہ عین علی کی توقعات کے مطابق بر آمد ہوا۔ محترمہ فاطمہ جناح ہار گئیں اور ایوب خان جیت گیا۔

محترمہ فاطمہ جناح کی ہار پاکستان کی ہار تھی اور ایوب خان کی جیت اُن قوتوں کی جیت تھی جو پاکستان کی قیمت پر ملک میں ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جہاں طاقت ور مادر پدر آزاد ہوں اور عوام غلامی کی ایسی زنجیروں میں جکڑ دیئے جائیں جس کے تانے بانے اُن کے پیدائشی دیہاتوں سے بین الاقوامی دارالخلافوں تک اس طرح پھیلیں کہ اُن کی گنجلکوں کو سلجھانے کی کوشش میں جبرائیل کے پر بھی جلنے لگیں۔ محترمہ الیکشن جیت جاتیں تو شاید پاکستان کسی حد تک خود کو سنبھال پاتا۔ ایوب کی جیت نے اَن سب امکانات کا دروازہ بند کر دیا تھا جس سے پاکستان میں خود اصلاحی کی صورت حال پیدا ہو سکتی تھی۔

علی، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹا، چوہدری فیض اور چوہدری فراغت حسین علی کے ڈیرے پر بیٹھے بعد از الیکشن صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

علی نے اپنے حالیہ دوروں کے دوران پیدا ہونے والے روابط کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا:

"مجیب الرحماں اور ولی خان سچے اور کھرے پاکستانی ہیں۔ اُنہوں نے محترمہ کے الیکشن کے ذریعے پاکستان کو اِس سڑک پر لڑھکنے سے روکنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یقیناً پاکستان کی تباہی کی شکل میں نکلے گا۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے جرنیلوں اور نوکر شاہی کے ساتھ مل کر اُن کی اِن کوششوں کو ناکام بنا دیا ہے۔ ایوب خان سمجھتا ہے کہ وہ الیکشن جیت گیا ہے۔ حالانکہ الیکشن اس نے نہیں ذوالفقار علی بھٹو نے جیتا ہے۔

ایوب خان واقعتاً وہ خچر ہے جس پر بھٹو نے اپنا سارا سیاسی بوجھ لاد دیا ہے۔ اور اب اِس بوجھ کے ساتھ ایوب خان کو اُس طرف ہانک رہا ہے جہاں جا کر وہ ایوب کو صدارت کی کرسی سے ردّی کے کاغذ کی طرح

پھینکے گا اور خود پاکستان کا حکمران بن جائے گا۔ بھٹو ایک مہم جو آدمی ہے جو خواہشِ اقتدار میں اس طرح مدہوش ہے کہ وہ اقتدار پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

جس طرح وہ کشمیر کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان کو جنگ میں دھکیل رہا ہے اس سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ہار جائیں گے لیکن بھٹو جیت جائے گا۔ جس جنگ کے شعلے وہ بھڑکانا چاہتا ہے اُسے اندازہ نہیں کہ اِس سے جو راکھ کا ڈھیر بر آمد ہو گا اس پر بیٹھ کر اگر وہ حکومت کرے گا تو وہ راکھ کا ڈھیر ایسے آتش فشاں میں ڈھل جائے گا جس سے اُگلنے والی آگ سے کوئی نہیں بچ پائے گا۔"

علی کی گفتگو سن کر چوہدری فیض اور چوہدری فراغت حسین بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

وہ بھٹو کے نام سے اچھی طرح آشنا تھے لیکن اُسے اِس طرح نہیں جانتے تھے جیسے علی اُس کے بارے میں بتا رہا تھا۔

چوہدری فیض نے بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں علی سے پوچھا: " کیا بھٹو واقعتاً اتنا طاقت ور ہے؟"

"ہاں۔ جی ایچ کیو میں اُس نے تمام اہم جرنیلوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ نوکر شاہی میں تمام اہم افراد ایوب خان کو کچھ بھی بتانے سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کو بریفنگ دیتے ہیں۔ اور پھر جیسے وہ کہتا ہے اس طرح ایوب خان کو چیزیں پیش کرتے ہیں۔ وزارت اطلاعات اُس کے کہنے پر قومی اور بین الاقوامی پریس کو ایسی من گھڑت خبریں جاری کرتی ہے جس سے بھٹو کے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔"

" اور وہ مقاصد کیا ہیں؟" چوہدری فیض نے ایک اور سوال پوچھا۔ "جیسے میں نے اوائلِ گفتگو میں کہا تھا وہ جنگ کے ذریعے ایوب خان کو کمزور کرنا چاہتا ہے۔ اُسے خوب اندازہ ہے کہ پاکستان جنگ کے ذریعے کشمیر آزاد نہیں کروا سکتا۔ وہ کشمیر کے اندر گوریلا کارروائیوں سے ہندوستان کو مجبور کر رہا کہ وہ پاکستان پر حملہ آور ہو۔ گوریلا کاروائیوں میں شدت لانے کے لیے وہ ایوب خان سے مسلسل کہہ رہا ہے کہ ان کاروایئوں سے ہندوستان مجبور ہو جائے گا کہ وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ حل کرے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ اِس سے صرف ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہو گی۔ اور جنگ کے مقاصد

پورے نہ ہونے کے نتیجے میں وہ ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک چلائے گا۔ جس کا کشمیر کے مسئلے پر اُس کی لگائی ہوئی آگ کا ایندھن بنیں گی دائیں بازو کی قوتیں۔ اور یوں ملک میں ایک ایسے خلفشار کا آغاز ہو گا جس کے نتائج کے بارے میں اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے لیکن حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"
زرینہ نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا: "اور مشرقی پاکستان کے لوگ پہلے ہی دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ اُن کی غربت اور غربت سے پیدا ہونے والے مسائل شاید اُنہیں اِن راہوں کی طرف لے جائیں جہاں مغربی اور مشرقی پاکستان کے راستے جدا ہو جائیں۔ محترمہ کے الیکشنوں کی شکل میں اُنہوں نے آخری کوشش کر دیکھی ہے جسے ایوب خان نے بھٹو کے مشوروں پر چلتے ہوئے ناکام بنا دیا ہے۔
ظاہری طور پر نظر آتا ہے کہ ماحول میں ایک سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ اگر بھٹو کی اسٹریٹجی پر عمل ہوتا رہا تو بہت جلد یہ سکون اور ٹھہراؤ ایسے طوفانوں میں بدل جائے گا جس سے بہت کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا۔"
چوہدری فراغت حسین جو اب تک بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے لیکن خاموش بیٹھے تھے آخر بول اٹھے: "تم لوگ مسئلے مسائل تو بتا رہے ہو۔ کوئی حل بھی تو بتاؤ۔ یہ بھی تو بتاؤ سرزمین پاکستان کی طرف بڑھتے ہوئے اِن طوفانوں کا رُخ کیسے موڑا جاسکتا ہے؟"
"ایک کوشش تو ہم نے کر لی ہے۔ محترمہ کے الیکشن کے ذریعے۔ اس میں ہم فیل ہو چکے ہیں۔ ہم نے مہم کے دوران کشمیر کے اندر پاکستان کی مداخلت کو مسئلہ بنانے کی کوشش کی لیکن وزارت داخلہ نے بھٹو کی مداخلت سے گمراہ کن خبریں جاری کر کے ہماری کوشش کو ناکام بنا دیا ہے۔ اگر ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کر سکتے ہیں تو ہمیں پاکستان کو کشمیر میں شروع کی گئی مہم جوئی سے روکنا ہے۔ اگر ہم یہ کر سکیں تو بھٹو کی اسٹریٹجی کی بنیادی اینٹ کھسک جائے گی اور پاکستان ان بڑے المیوں سے بچ جائے گا جو مسلسل پاکستان کے افق پر خوفناک طوفانوں کا روپ دھارنے کی تیاری کر رہے ہیں۔" علی نے چوہدری فراغت حسین کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
چوہدری فیض نے اس مسئلے پر رائے دیتے ہوئے کہا: "ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم یہ سب کچھ کرنے

کے باوجود عام پاکستانی ہیں۔ ہم پاکستان کی خاطر کچھ کرنے کی کوشش ضرور کرسکتے ہیں لیکن حکومتی سیٹ اپ میں جو لوگ شامل ہیں اُن کے اقدامات کو روکنا اور خاص طور پر وہ بھی ایسے دور میں جب ایک ملٹری کا کمانڈر انچیف بظاہر اً الیکشنوں کا ڈرامہ رچا کر سویلین صدر کی صورت میں پاکستان پر قابض ہو ہم لوگوں کے لیے ایک انتہائی دشوار امر ہے۔ بھٹو اِس سیٹ اپ کا اہم حصہ ہے۔ ایوب خان صرف نام کا صدر ہے۔ سب حکومتی ادارے ذوالفقار علی بھٹو کے گرد گھومتے ہیں۔ ایسی شکل میں اگر جی ایچ کیو اور فارن آفس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اُنہیں ہندوستان سے جنگ کے رسک پر بھی کشمیر کے اندر دراندازی کرنی ہے تو وہ ہماری تمام کوششوں کے باوجود یہ کر گزریں گے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اب تک جتنی جدوجہد کی ہے سب بے معنی ہے۔ اس کا کوئی مطلب اور مفہوم نہیں۔" زرینہ نے چوہدری فیض کے ردعمل میں سوال اُٹھایا۔

"کسی اچھے کام کے لیے جدوجہد کرنا ہر انسان کا ذاتی فیصلہ ہے۔ اگر ہم یہ سب کچھ نہ کرنا چاہتے تو ہمیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہمارا آزادانہ فیصلہ تھا کہ ہم پاکستان کو بہتر ملک بنانے کے لیے جدوجہد کریں۔ ہم نے دائیں بائیں بازو کے تمام سیاسی نظریات کا سیر حاصل مطالعہ کیا۔ جو اچھا لگا اُسے اپنا لیا۔ جو کام کرنے کی دل نے گواہی نہ دی اُس سے خود کو دور رکھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ کسی کے مفاد میں نہیں۔ نہ پاکستان کے نہ ہندوستان کے۔ کوئی اگر ذاتی سیاسی مقاصد کے لیے پاکستان کو جنگ کی طرف دھکیل رہا ہے تو ہمیں اس کے خلاف مقدور بھر آواز اُٹھانی چاہیئے۔

مغربی پاکستان سے ولی خان اور مشرقی پاکستان سے مجیب الرحمان دو قد آور شخصیات ہیں۔ ان سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اور کشمیر میں جارحانہ دراندازی کی بجائے کشمیر کا ڈپلومیٹک حل ڈھونڈھنے کے لیے حکومت کو آمادہ کریں۔" علی نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوے کہا۔

"لیکن اس سلسلے میں جو سب سے خطرناک کام ہو رہا ہے اس کی طرف آپ میں سے کسی نے توجہ نہیں دی۔" سلیم موٹے نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا

"اور وہ کیا ہے؟" زرینہ نے سلیم موٹے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" سارے پاکستان میں کشمیر کے حوالے سے وال چاکنگ ہو رہی۔ کرش انڈیا کے نعرے لکھے جا رہے ہیں۔ جنگ کے حوالے سے ملک میں ذہنی ہیجان پیدا کیا جا رہا ہے۔"

"یہ واقعتاً سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اِس وال چاکنگ کے پیچھے وہی قوتیں ہیں جو چاہتی ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہو۔ اور پاکستان ایسے مسائل میں گھر جائے جن سے نبرد آزما ہونا اُس کے لیے ممکن نہ رہے۔" چوہدری فیض نے سلیم موٹے کے نقطہ نظر کو ایک نئ فکری جہت دیتے ہوئے کہا۔

چوہدری فراغت حسین نے گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے علی سے کہا کہ اب وہ محترمہ کی انتخابی مہم سے فارغ ہو چکا ہے۔ الیکشن ہو چکے ہیں۔ اُن کا نتیجہ بھی حسب توقع بر آمد ہو چکا ہے۔ اَب اُسے اور زرینہ کو زمینوں کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ علی نے چوہدری صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے لیکن اِس بارے میں وہی ہو گا جو زرینہ کہے گی۔ یہ بجا ہے کہ زرینہ میری بیوی ہے۔ لیکن جو کچھ اُسے وراثت میں مل رہا ہے اسے کس طرح سنبھالنا ہے اس کا فیصلہ وہی کرے گی۔ تاہم میں اس کی ہر کوشش میں دل و جان سے اس کے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ اور جیسے وہ چاہے گی ویسے ہی ہو گا۔

زرینہ نے محبت بھری نظروں سے علی کی طرف دیکھا اور کہا کہ وہ علی کے اپنی زمینوں پر تجربے سے بہت متاثر ہے۔ اس کے نتائج وہاں آنے والی سماجی اور معاشی تبدیلی سے واضح ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ لوگ خوش ہیں۔ اُن کا معیارِ زندگی مسلسل بہتر ہو رہا ہے۔ سارے بچے، لڑکیاں اور لڑکے، چمکتے چہروں اور عمدہ لباسوں میں ہر صبح سکولوں میں جاتے ہیں۔ بیماری کی صورت میں علاقے کے سب لوگوں کو علاج معالجے کی سہولتیں حاصل ہیں۔ سارا علاقہ تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ہے۔ ملیں علاقے کی ضرورت سے کہیں زیادہ چینی، گھی، چاول اور آٹے کی پیداوار دے رہی ہیں۔ جس سے علاقے میں

سرمائے کی آمد کی رفتار تیز ہو چکی ہے۔ اتنے اچھے نظام کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ اور سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں مزید وقت ضائع کیے بغیر اپنے علاقے میں پڑنے والے دیہاتوں میں بھی یہ نظام متعارف کروادینا چاہیے۔

چوہدری فراغت حسین نے زرینہ کے خیالات کو سراہتے ہوئے کہا مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ زرینہ بھی ویسے ہی سوچتی ہے جیسے علی سوچتا ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک اور بہت اچھی خبر یہ ہے کہ ہماری زمینوں کے درمیان چند چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں جو علی کے قائم کردہ نظام سے بہت متاثر ہیں۔ میری اُن سب سے بات چیت چل رہی ہے۔ وہ سب چاہتے ہیں کہ علی کے نظام کا حصہ بن جائیں تاکہ اُن کے علاقوں میں بھی اُسی طرح تعمیر و ترقی کے دروازے کھل جائیں۔ اگر ہم ان کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اُنہیں بھی اس نظام میں شامل کر لیتے ہیں تو ایک بہت بڑا علاقہ سیلف گورننس کے اصولوں کے تحت پورے ملک کے لیے ایک ایسی مثال بن سکتا ہے جس سے لوگوں کی زندگیوں میں سماجی اور معاشی انقلاب آسکتا ہے۔

چوہدری فراغت حسین کی گفتگو سے علی کو اطمینان حاصل ہوا۔ وہ کام جو اپنے باپ کی زندگی میں اپنی زمینوں پر نہیں کر سکا تھا اُس کے سسر چوہدری فراغت حسین اپنی زندگی میں کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی باتیں سن کر علی نے کہا: "عوام میں بے پناہ توانائی ہوتی ہے۔ وہ ایک سیلاب کے ریلے کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر اُن کی توانائیوں کو منصوبہ بندی سے مناسب راستوں پر ڈال دیا جائے تو وہ تعمیر و ترقی کے ایسے معجزے سرانجام دے سکتے ہیں کہ انسانی عقل و فکر دنگ رہ جاتی ہے۔ ان کی توانائیوں کو مناسب راستے پر ڈالنے کی منصوبہ بندی کرنا وہ کام ہے جو قیادت کو کرنا ہوتا ہے۔ اتنے تھوڑے عرصے میں ہمارے لوگوں نے جس طرح علاقے میں انقلاب برپا کیا ہے وہ عوامی توانائی کو منصوبہ بندی کے ساتھ استعمال کرنے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اب اگر اردگرد کے علاقے بھی اس نظام کا حصہ بن جاتے ہیں تو عوامی

طاقت سے جو انقلاب آئے گا دنیا میں اِس کی دوسری مثال دکھائی نہیں دے گی۔ لیکن اگر ہمیں یہ کام کرنا ہے تو ہمیں ان علاقوں کے عوام کو اعتماد میں لینا ہو گا۔

یہ بجا ہے کہ وہ وسائل کے اشتراک کی بنیاد پر ہونے والی ترقی کی برکات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن پھر بھی ان کا آزادانہ فیصلہ کہ وہ اپنے علاقے میں اس طرح کے نظام کے تحت زندگی گزارنا چاہتے ہیں بہت ضروری ہے۔ ہم یہ نظام قائم کرنے میں اُن کی بھرپور اعانت کریں گے لیکن عملی طور پر سارا کام اُنہیں خود کرنا پڑے گا۔ تبدیلی کا عمل کبھی آسان نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں اکھاڑ پچھاڑ سے اُنہیں دشواریاں ہوں گی لیکن آخر کار جب سماجی و معاشی مشین حرکت میں آئے گی اور اُنہیں اس کے ثمرات ملنا شروع ہوں گے تو ان کی زندگیوں میں آسودگی پیدا ہوتی جائے گی۔

یہ کہہ کر اس نے صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ آئندہ چند ماہ چوہدری فراغت حسین کے ڈیرے پر گزاریں اور لوگوں کو ذہنی طور پر اِس تبدیلی کے لیے تیار کریں۔ ان کی رائے لیں کہ وہ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ان کے خدشات کا ازالہ کریں۔ ان کی توقعات کا تخمینہ لگائیں۔

چوہدری فراغت حسین، چوہدری فیض اور زرینہ خوش تھے کہ ان کے اقدامات سے کچھ لوگوں کی زندگیوں میں بہتری آئے گی۔ وہ چاہتے تھے کہ سارے پاکستان کے عوام وسائل کے مشترکہ نظام کی برکات سے فائدہ اُٹھائیں اور ان کی زندگیوں میں بھی ویسے ہی بہتری آئے۔ لیکن اُنہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ انقلاب خود بخود برپا نہیں ہوتے۔ انقلاب لانے پڑتے ہیں۔ لوگوں کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تاریخ کا جبر صرف راہیں ہموار کرتا ہے۔ باقی کام لوگوں کو کرنے پڑتے ہیں۔ اگر لوگ جدوجہد نہ کریں تو تاریخ کا جبر اُنہیں روندھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

فصل 42

بارشوں کا موسم ختم ہوا چاہتا تھا اور سردیاں آہستہ آہستہ کشمیر کی پہاڑیوں سے پنجاب کے میدانوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

بھٹو نے چند جرنیلوں کے ساتھ مل کر کشمیر میں جس خونی کھیل کا آغاز کیا تھا اُس کے نتائج مشرقی بارڈر پر ہندوستان کے حملے کے صورت میں سامنے آ چکے تھے۔ ہندوستانی فوجوں نے پاکستان پر چڑھائی کر دی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کھلی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

یہی چیز تھی جس کا علی کو خطرہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کا میدان جنگ میں کبھی بھی آمنا سامنا ہو۔ ہندوستانی اور پاکستانی اُس کے اپنے لوگ تھے اور اُسے ان کی نفسیات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اُسے خطرہ تھا اگر ایک بار ہندوستان اور پاکستان میں کھلی جنگ ہوئی تو پھر یہ سلسلہ اُس وقت تک چلتا رہے گا جب تک ایک یا دوسرے کی مکمل شکست نہیں ہو جاتی۔ اور یہ ایک ایسا راستہ تھا جس پر چل کر دونوں اسیل مرغوں کی طرح لہولہان ہو جاتے تو بھی اُن کی دشمنی چلتی رہتی تھی۔

علی اور زرینہ کی جنگ کو روکنے کی کوششوں کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے جنگی جہاز ایک دوسرے کے شہروں میں اپنے اپنے اہداف پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگا رہے تھے۔ دونوں ملکوں کی فوجیں بارڈر پر ایک دوسرے پر توپوں سے گولے پھینک رہی تھیں۔ آکاش وانی اور ریڈیو پاکستان خبروں اور قومی ترانوں سے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

علی نے اپنے علاقے میں سب لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ افواج پاکستان کی بھرپور مدد کریں۔ جس کے نتیجے میں تمام نوجوان لڑکیاں اور لڑکے دن رات شفٹوں میں قریبی اسلحہ ڈپوؤں پر افواج پاکستان کے شانہ بشانہ فوجی ٹرکوں پر اسلحہ لوڈ اور آف لوڈ کر رہے تھے۔ جگہ جگہ خندقوں کی کھدائی کر رہے تھے۔

رات کی تاریکی میں آبادیوں میں چکر لگا کر دیکھتے کہ کہیں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دے تاکہ ہندوستانی بمباروں کو رات کی تاریکی میں آبادی کا اندازہ نہ ہو۔

علی کو اپنے قائم کردہ نظام کی طاقت کے نئے پہلو دیکھنے کو مل رہے تھے۔ جس تیزی کے ساتھ اور جس طرح اس کے علاقے کے لوگوں نے جنگ شروع ہونے کے بعد خود کو جنگی نظام کی دفاعی لائن کا حصہ بنایا تھا یہ اس کے لیے ایک حیرت ناک امر تھا۔

اگر لوگ منظم ہوں تو وہ امن اور جنگ کی حالت میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اس کے علاقے کے شہریوں کی پرفارمنس سے ارد گرد کے شہروں کے لوگ بھی متاثر تھے۔ کئی ٹاؤن کمیٹیوں کے چیرمینوں کی طرف سے درخواستیں آنا شروع ہو گئیں کہ اُن کے علاقے کے نوجوانوں کو منظم کرنے میں اُن کی مدد کریں تاکہ وہ بھی پاکستانی افواج اور اپنے شہریوں کی مدد کر سکیں۔

علی اور زرینہ نے اپنے علاقے کے نوجوانوں کی کئی کمیٹیاں بنائیں جنہیں فوری طور پر ملحقہ شہروں میں بھجوایا تاکہ وہاں نوجوانوں کی تنظیم سازی کریں۔

اِن کوششوں سے سارے علاقے میں ایک ایسے نظام نے جنم لیا جو حالتِ جنگ اور امن میں سماجی بہبود کے اہم یونٹس کے طور پر سامنے آیا۔

جنگ کی اصل ہولناکی اُس وقت دیکھنے میں آئی جب لاکھوں لوگ مختلف سیکٹروں سے گھر بار چھوڑ کر اُندرونِ پاکستان علاقوں میں پہنچے۔ ایوب خان کی حکومت نے پاکستان کو جس جنگ میں جھونک دیا تھا اُس کے سماجی اور معاشی اثرات جنگ ہوتے ہی ظاہر ہونے لگے۔ مارکیٹ سے روزمرہ کے استعمال کی چیزیں غائب ہو چکی تھیں۔ نواب آف کالا باغ لاہور گورنر ہاؤس میں پاکستان بھر کے تاجران کے نمائندوں کو بلا کر دھمکیاں لگا رہا تھا کہ وہ روزمرہ استعمال کی اشیا کی سپلائی جاری رکھیں لیکن ذخیرہ اندوزوں نے جنگ کی شکل میں پیدا ہونے والی غیر یقینی کی وجہ سے اشیا خفیہ گوداموں میں ذخیرہ کر دی تھیں اور دگنے تگنے ریٹوں پر بیچ رہے تھے۔

محاذوں سے اُجڑے پجُڑے لوگوں کے آنے والے قافلوں سے شہروں کا پہلے سے کمزور سماجی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ بے گھر ہونے والے لوگوں میں سے زیادہ تر نے اسکولوں کی عمارتوں میں ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ جہاں اُن کے رہنے سہنے کا نہ مناسب انتظام تھا اور نہ زندگی کی دیگر ضروریات کے لیے مناسب سہولتیں۔

علی اور زرینہ نے تیزی کے ساتھ اپنے علاقے میں ہزاروں بے گھر خاندانوں کے لیے عارضی رہائش گاہیں کھڑی کیں اور اُن کے مشکل وقت میں اُن کی زندگی کو بنیادی آسائشیں فراہم کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں کیں۔

جس دن سے ہندوستان اور پاکستان میں جنگ شروع ہوئی تھی علی اور زرینہ نے خود پر رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر لیا تھا۔ اُن کے شب و روز جنگ کے متاثرین کے لیے وقف تھے۔ زرینہ محسوس کر رہی تھی کہ علی ایک عجیب و غریب ذہنی دباو کا شکار ہے۔

بظاہر وہ خندہ پیشانی سے متاثرین جنگ کے امور سرانجام دے رہا تھا لیکن جنگ کے پہلے دن سے اُس نے جیبی ٹرانسسٹر جیب میں ڈال رکھا تھا۔ ہر وقت کبھی آکاش وانی، کبھی ریڈیو پاکستان اور کبھی بی بی سی سے خبریں سنتا۔

پاکستان کے جنگی جہاز ہندوستانی شہروں پر بمب گراتے تو اپنے بچپن کے ہندو اور سکھ دوستوں کو یاد کرتا۔ ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتا۔ ہندوستانی بمبار پاکستانی شہروں پر حملہ آور ہوتے تو دکھی ہو کر حکومت کو کوسنے دیتا جس نے ہندوستان اور پاکستان پر موجودہ جنگ مسلط کی تھی۔ اور پھر پاگلوں کی طرح چلانے لگتا۔

"موجودہ حکمران حمائت کے نام پر کشمیریوں سے دشمنی کر رہے ہیں۔ اپنا ذاتی ایجنڈا آگے بڑھانے کے لیئے دونوں ملکوں کے مستقبل کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔"

زرینہ گھبرا کر آرام کرنے کا مشورہ دیتی تو کہتا جب تک جنگ ختم نہیں ہو گی وہ آرام نہیں کرے گا۔

پھر زرینہ سے الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگتا:

"زری جان یہ انسان جنگ کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ دھرتی ماں کی چھاتیوں میں اتنا دودھ ہے کہ وہ کھربوں سالوں تک اپنے ہر بچے کی پرورش کر سکتی ہے۔

زری جان اقتدار میں آنے کے بعد انسانوں کی شخصیت کے بدترین پہلوان پر کیوں غالب آجاتے ہیں؟

بھٹو چند سر پھرے جرنیلوں اور نوکر شاہی کے چند خود غرض افسروں کے ساتھ مل کر جس طرح پاکستان کا بیڑہ غرق کر رہاہے اور خچر ایوب خان جس طرح ان کے بوجھ سے ہانپ رہاہے ایسا کب تک چلے گا؟

زری جان بھٹو میں ہٹلر کی روح حلول کر گئی ہے۔ دیکھنا یہ پاکستان کو تباہ کیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ وہ پاکستان میں جو زہر یلے پودے بو رہاہے پاکستان کبھی ان سے جانبر نہیں ہو سکے گا۔"

زرینہ اس کی باتوں سے خوف زدہ ہو جاتی اور پھر اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کسی پراجیکٹ کا ذکر چھیڑ دیتی۔

" علی جان آج ہسپتالوں میں بمباری سے زخمی ہونے والے کتنے لوگ آئے ہیں؟"

" پنتیس مرد، سات عورتیں اور تین بچے۔" وہ فوراً جواب دیتا۔

"اور سکولوں میں اور کتنے خاندان پہنچے ہیں؟" پھر وہ ان کی تفصیل بتانے لگتا۔ پراجیکٹ کی تفصیل ختم ہوتی تو پھر بھٹو کی طرف لوٹ آتا۔

"زری جان تمہیں پتہ ہے بھٹو ذہنی مریض ہے۔ سخت احساس کمتری کا شکار ہے۔ رات کے وقت خیالی طور

پر ہٹلر سے گفتگو کرتا ہے۔ اس سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ بہت کم سوتا ہے۔ اگر سو جائے تو نیند میں ہٹلر کی تقریروں کے جملے بڑبڑاتا ہے۔"

زرینہ علی کی ان باتوں پر جنگ کی روز بروز کی ہولناک خبروں کے باوجود کھل کھلا کر ہنس پڑتی۔

"ہٹلر بھی احساس کمتری کا شکار تھا۔ احساس کمتری کے مارے ہوئے کردار اگر ریاستی طاقت پر قابض ہو جائیں تو اکثر ان کا احساس کمتری احساس برتری میں بدل جاتا ہے اور پھر وہ ایسی تباہی و بربادی پھیلاتے ہیں کہ ہر چیز تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات لاکھوں کروڑوں لوگوں کی ہلاکتوں کا سبب بنتے ہیں۔

بھٹو جنگ کے ذریعے جو کھیل کھیل رہا ہے اس سے پاکستان میں بہت تباہی و بربادی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس

جنگ میں پاکستان اپنے وجود کی جنگ ہار جائے۔"

"علی جان ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ یو این او نے پہلے ہی جنگ رکوانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ سوویت یونین ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثالث بننے پر آمادہ ہے۔ جنگ رُک جائے گی تو چیزیں دوبارہ راستے پر واپس آ جائیں گی۔" زرینہ اسے تسلی دیتی۔

"نہیں زری جان۔ یہ جنگ اس وقت اگر رک بھی گئی تو اس سے ہندوستان اور پاکستان کے دل صاف نہیں ہوں گے۔ اور بھٹو کی منظر پر موجودگی کی وجہ سے یہ جنگ پھر چھڑے گی اور کسی ایک کی حتمی شکست تک جاری رہے گی۔ ہندوستان اور پاکستان نے پر امن بقائے باہمی کے اصول کو چھوڑ کر مسلح مسابقت کا جو راستہ اپنا لیا ہے اس کے نتائج دونوں کے لیے انتہائی خطرناک ہوں گے۔ ہندوستان کے لیے کم اور پاکستان کے لیے زیادہ۔ "

جنگ کے پیدا کردہ انہی مسائل سے نبرد آزما ہوتے علی اور زرینہ کے لیے وہ دن انتہائی پر مسرت تھا جب بی بی سی نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فائر بندی کے باہمی اتفاق کی خبر نشر کی تھی۔

اس دن دونوں نے کئی دن بعد گرم پانی سے غسل کیا اور آرام دہ لباس پہن کر سستانے کے لیے خواب گاہ میں بستر پر لیٹے تو چند ثانیوں میں اس طرح سوئے جیسے صدیوں کے تھکا دینے والے سفر سے لوٹے ہوں۔ اور نیند کے علاوہ اُنہیں کسی اور چیز سے سروکار نہ ہو۔

فصل 43

علی اور زرینہ کی اگلی چند بہاریں چوہدری فراغت حسین کی زمین کو علی کے اپنی زمین پر قائم کردہ نظام سے ہم آہنگ کرتے بیت گئیں۔ چند اور مقامی زمین داروں نے علی کے نظام کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا تو پنجاب کے اندر ایک چھوٹی سی ریاست قائم ہو گئی۔ جس کا نظام باقی پاکستان سے مختلف تھا۔

چوہدری فراغت حسین جس خوش دلی سے اس پروگرام میں شامل ہوئے تھے اِس سے علی اور زرینہ دونوں بہت خوش تھے اور اُسے اپنی اور اپنے علاقے کے عوام کی ایک بہت بڑی فتح گردانتے تھے۔

زمین داری کا صدیوں پرانا نظام جس میں زمیں دار ملکیت کے چکر میں بعض اوقات پشتوں تک اپنے حریفوں سے قتل و غارت اور مبارزت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں چوہدری فراغت حسین کی اتنی آسانی کے ساتھ اس سے دست کشی علاقے کے دوسرے چھوٹے زمیں داروں کے لیے ایک مثال بن گئی جس کی وجہ سے وہ سب اس نظام کا حصہ بن گئے۔ اِس نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کسی سے کچھ چھینا نہیں گیا تھا۔ اِس نظام کا حصہ بننے والوں کا لائف اسٹائل متاثر نہیں ہوا تھا۔ دوسروں کے ساتھ اپنے وسائل میں شراکت سے علاقے میں اُن کی عزت اور بڑھ گئی تھی۔ علی اور زرینہ بلاشبہ اس نظام کے ہیرو تھے۔ جب کہ چوہدری فراغت حسین کو ایک سرپرست کی حیثیت حاصل تھی۔

اِس نظام کی کامیابی سے پاکستان میں ایک نئی بحث چھڑ گئی تھی۔ یہ ایک ایسا ماڈل تھا جس سے نہ صرف لوگوں کو روٹی، کپڑا اور مکان ملا تھا بلکہ نئے ماڈل گاؤں منظر پر اُبھرے تھے جو ہر اعتبار سے ایسے سماجی ماڈل تھے جہاں زندگی بسر کرنے والے شاداں و فرحاں اپنے معاملات کامیابی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ ہر خاندان کے پاس اس کی ضرورت کے مطابق رہنے کے لیے کشادہ اور جدید سہولتوں سے مزّین گھر تھا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے سکول اور کالج تھے۔ سارے دیہاتوں کی اپنی اپنی فٹ بال، ہاکی اور کرکٹ

ٹیمیں تھیں جن میں باقاعدگی سے مقابلے ہوتے۔ خوبصورت مسجدیں تھیں جہاں صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس کسان روحانی مسرت سے چمکتے چہروں کے ساتھ خدا کی عبادت کرتے اور دعا کرتے کہ اللہ تعالی باقی ملک کے بااثر افراد کو توفیق دے کہ وہ بھی اپنے علاقوں میں ایسا نظام قائم کریں۔ سب مسجدوں کے امام صوفی منش عالم تھے جو لوگوں کو جہنم کے عذاب سے ڈرانے کی بجائے خدا کی محبت کا درس دیتے اور اس محبت کو انسانوں کی محبت سے مشروط کرنے کی تلقین کرتے۔ یہ مذھب کی ایک نئ جہت تھی جو علی کے قائم کردہ نظام کے ذریعے لوگوں کے سامنے آ رہی تھی۔

جب علی کے علاقے میں یہ خاموش معجزہ رونما ہو رہا تھا باقی سارا پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی جلائی ہوئی آگ میں جل رہا تھا۔ 1965 کی جنگ کے بعد تاشقند میں ایک سوچے سمجھے ظاہری اختلاف کے بعد بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی بنا کر ایوب خان کے خلاف تحریک چلا کر اپنے حامی جرنیلوں کے ذریعے اسے اقتدار سے باہر کر دیا تھا جس کے نتیجے میں پاکستان پر جنرل یحیی خان مسلط ہوا۔

یحیی خان بھی ان جرنیلوں میں سے تھا جس کے بھٹو کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ یحیی خان کے اقتدار میں آنے کے بعد بھی بھٹو کے نہ صرف اس کے ساتھ قریبی تعلقات قائم رہے بلکہ بھٹو اپنی شاطرانہ فطرت کی وجہ سے یحیی خان کی کیبنٹ میں بیٹھنے والے کئی سویلین مشیروں کے ذریعے نہ صرف حکومتی فیصلوں پر اثر انداز ہوتا بلکہ کیبنٹ کے اندر ہونے والے خفیہ فیصلوں سے خود کو باخبر رکھتا۔

یحیی خان کے ان مشیروں میں اس کے اقتصادی امور کے ایڈوایزر ایم ایم احمد خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ ایم ایم احمد اور بھٹو کے درمیان کمیونکیشن ایک کلرک کے ذریعے ہوتی تھی جس کا نام نور حسین تھا۔ نور حسین ایم ایم احمد کے اسٹاف میں شامل تھا۔ اسے ذولفقار علی بھٹو تک رسائی حاصل تھی۔ بھٹو کی اپنے قریبی حلقوں کو ہدایت تھی کہ نور حسین کی طرف سے ملنے والا مٹیریل فوراً اسے ملنا چاہیۓ۔

بھٹو ایک طرف براہ راست یحییٰ خان سے رابطے سے دن بدن کے حکومتی معاملات سے آگاہ رہتا تو دوسری طرف ایم ایم احمد کی طرف سے نور حسین کے ذریعے ملنے والی رپورٹوں سے اُس چیز کی تصدیق کرتا کہ یحییٰ خان کہیں اُسے کسی معاملے پر گمراہ تو نہیں کر رہا۔

مجیب الرحمان کو بھٹو کی اس حکمت عملی کا پتہ تھا اور وہ اُس کی وجہ سے اسلام آباد کے فوجی حکمران اور اس کے قریبی حلقوں پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔

علی نور حسین کو طالب علمی کے زمانے سے میئر کے آفس سے جانتا تھا۔ نور حسین کیبنٹ کے خفیہ فیصلوں کی ایم ایم احمد کی رپورٹیں بھٹو صاحب کو پہنچاتا ساتھ ہی ان کی کاپیاں علی کو بھی میل کر دیتا جس سے علی حکومتی سطح پر ہونے والے معاملات سے باخبر رہتا۔

1970 کے الیکشنوں سے پہلے مجیب الرحمان کی علی اور زرینہ سے کئی بار بات ہوئی۔ وہ ہمیشہ بھٹو اور جی ایچ کیو کی باہمی ملی بھگت کی شکایت کرتا۔ وہ کہتا بھٹو سب کو گمراہ کر رہا ہے۔ ایک طرف وہ جی ایچ کیو کو اور یحییٰ خان کو گمراہ کر رہا ہے اور دوسری طرف پاکستان کے عوام کو۔ اُسے نہ سوشلزم سے دلچسپی ہے نہ اسلام سے اور نہ جمہوریت سے۔ نہ وہ لوگوں کو روٹی، کپڑا، اور مکان فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے اور کشمیر کی آزادی میں۔

وہ اتنا خود غرض انسان ہے کہ ذاتی انانیت اور مفاد کے لیے ملک کی سالمیت کو داؤ پر لگا رہا ہے۔ ایک طرح سے مجیب الرحمان یحییٰ خان کو بھٹو سے بہتر انسان خیال کرتا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ یحییٰ خان نے ون یونٹ ختم کر کے اور قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کی عددی برتری بحال کر کے اپنی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

مغربی پاکستان میں بھی اس نے پرانے صوبوں کو بحال کر کے اچھا کام کیا ہے۔ جس سے صوبوں کو اپنے معاملات پر زیادہ اختیار حاصل ہو گا اور وہ اپنے عوام کے مفادات کا بہتر تحفظ کر سکیں گے۔

علی کو مجیب الرحمان کی باتوں سے مکمل اتفاق تھا۔ وہ بھٹو کے بارے میں اتنا کچھ جانتا تھا کہ مجیب الرحمان کی بھٹو کے بارے میں انفارمیشن اُسے مبادی نظر آتی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ مجیب الرحمان بھٹو کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔

مجیب الرحمان علی سے ہمیشہ ایک ہی درخواست کرتا کہ وہ کسی طرح مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کے ذریعے جی ایچ کیو اور بھٹو کو باہمی سازشوں سے روکے ورنہ پاکستان سلامت نہیں رہے گا۔ علی نے مجیب الرحمان کے کہنے پر چوہدری فیض، صفدر شاہ، اور اظہر پر مبنی ایک تین رکنی کمیٹی بنا کر اُنہیں پاکستان کے سب سرکردہ پاکستانی سیاست دانوں کے پاس بھیجا کہ وہ ان تک مجیب الرحمان کے خدشات کی تفصیل پہنچائیں اور اُنہیں سمجھائیں کہ وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے بھٹو۔جی ایچ کیو گٹھ جوڑ ختم کرائیں۔

مجیب الرحمان علی کے نظام سے بہت متاثر تھا۔ وہ کہتا تھا اگر اس کی پارٹی کامیاب ہوئی تو وہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں یہ نظام قائم کرے گا۔

علی کی بنائی کمیٹی نے چوہدری فیض کی سربراہی میں مغربی پاکستان کے دائیں اور بائیں بازو کے سب سیاست دانوں سے ملاقات کی اور اُنہیں مشرقی پاکستانیوں کے خدشات سے آگاہ کیا۔ لیکن سوائے ولی خان کے کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ کھل کر جی ایچ کیو بھٹو گٹھ جوڑ پر بات کرتا۔

لیکن جس طرح جی ایچ کیو ولی خان اور ان کی پارٹی کو دیکھتا تھا اس سے جی ایچ کیو اور ذوالفقار علی بھٹو گٹھ جوڑ میں مزید شدت آئی۔ جرنیلوں نے اپنے گھوڑوں کو مزید سرپٹ دوڑانا شروع کیا تاکہ بھٹو کو الیکشنوں میں کامیاب کروایا جاسکے۔

اس مقصد کے تحت یحییٰ خان نے جنرل الیکشن کی تاریخ بھی دو تین ماہ آگے بڑھائی۔ لیکن اس کا نتیجہ بھی جی ایچ کیو کی خواہشات کے برعکس نکلا۔

جی ایچ کیو کے کہنے پر یحییٰ خان نے الیکشنوں کی تاریخ اکتوبر سے دسمبر میں تبدیل کی لیکن چند دنوں بعد مشرقی پاکستان میں تاریخ کا بدترین سمندری طوفان آیا۔ جس سے اتنی تباہی وبربادی ہوئی کہ مشرقی پاکستان والے بلبلا اٹھے۔

بنگالی لیڈروں نے فوجی حکومت پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ مولانا بھاشانی کی نیپ نے باقاعدہ الیکشنوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جس کا فائدہ براہ راست مجیب الرحمان کی پارٹی کو پہنچا جو الیکشنوں میں سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے سامنے آئی۔

مجیب الرحمان کی الیکشنوں میں نمایاں کامیابی نے بھٹو کی اُمیدوں اور خواہشوں پر پانی پھیر دیا۔ جی ایچ کیو کی خواہشات اور گٹھ جوڑ کے باوجود بھٹو کی پارٹی کو مجیب الرحمان کی پارٹی سے آدھی سیٹیں ملیں۔ مجیب الرحمان تنہا اس پوزیشن میں تھا کہ وہ اپنی حکومت بناتا۔ لیکن جی ایچ کیو نے بھٹو کے ساتھ مل کر کوششیں شروع کر دیں کہ اقتدار کسی طرح مجیب الرحمان کو منتقل نہ ہونے پائے۔

علی اور زرینہ اس دوران مجیب الرحمان سے مسلسل رابطے میں رہے۔ اُنہوں نے درپردہ مجیب الرحمان کو آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ کچھ لچک دکھا کر جی ایچ کیو اور بھٹو کی سازشوں کو ناکام بنائے۔ لیکن مجیب الرحمان کے ساتھیوں کے بے لچک رویئے سے مجیب الرحمان علی کے مشوروں پر عمل کرنے سے قاصر رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ماہ بعد بھٹو کے کہنے پر یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن شروع کر دیا۔

مجیب الرحمان کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے آئے بندوق کے زور پر بنگالیوں کے مینڈیٹ کے پُرزے کر دیئے جس کے نتیجے میں بنگالیوں نے آزاد بنگلہ دیش کا مطالبہ کر دیا۔ مجیب الرحمان کی پارٹی کے زیادہ تر سینیئر قائدین ہندوستان ہجرت کر گئے۔ جہاں اُنہوں نے بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت قائم کی۔ اور ایک آزاد بنگلہ دیش کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔

علی یہ سب کچھ دیکھ سن کر خون کے آنسو روتا اور اپنی بے بسی پر دُکھ کا اظہار کرتا۔ اس نے بارہا چوہدری

فیض، چوہدری فراغت حسین، زرینہ، صفدر شاہ، سلیم موٹے اور اظہر سے مشورہ کیا کہ وہ پاکستان کو بچانے کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔

لیکن کسی کے پاس کوئی واضح تجویز نہیں تھی۔ یحیٰی خان نے صورت حال میں اس قدر بگاڑ پیدا کر دیا تھا کہ اب اگر وہ مجیب الرحمان کی ساری شرائط مان کر اقتدار اس کے حوالے بھی کر دیتا تو مغربی اور مشرقی پاکستان کو متحد رکھنا ممکن نہیں تھا۔

پھر بھی علی نے اپنے ذرائع سے کوشش کی کہ وہ مجیب الرحمان سے ملاقات کرے اور کسی طرح پاکستان کو بچانے کے لیے اُس کے ساتھ مل کر کوئی حل نکالے۔

علی کے ذرائع نے اُسے اطلاع دی کہ مجیب الرحمان کو سہالہ ریسٹ ہاوس میں رکھا گیا ہے اور سوائے چند جرنیلوں کے کسی کو اُس سے ملنے کی اجازت نہیں۔

ان اطلاعات کے باوجود علی اور زرینہ چوہدری فیض کی معیت میں مجیب الرحمان سے ملاقات کے لیے سہالہ پہنچے۔

اُنہیں خوب اندازہ تھا کہ اب چیزیں مجیب الرحمان کے ہاتھ میں نہیں لیکن پھر بھی اُس کی شخصیت میں اُنہیں پاکستان کو بچانے کے لیے اُمید کی ایک کرن دکھائی دیتی تھی۔ وہ بہرحال بنگالیوں کا ایک متفقہ لیڈر تھا۔ اُس میں لیڈروں والی وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو زخمی عوام کے بپھرے ہوے طوفانوں کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ لیکن مجیب الرحمان سے زیادہ علی کو بھٹو کی انانیت سے خطرے کی بُو آتی تھی اورالمیہ یہ تھا کہ یحیٰی خان اس وقت مکمل طور پر اس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔

شراب کے نشے میں دھت رہنے والا یحیٰی خان قوت فیصلہ سے محروم ہو چکا تھا۔ بھٹو چند دیگر جرنیلوں کے ساتھ مل کر یحیٰی خان کی اس کمزوری کا سیاسی فائدہ اُٹھا رہا تھا۔

علی اور زرینہ سہالہ ریسٹ ہاوس پہنچے تو وہاں انچارج بریگیڈیر نے اُنہیں پوچھا کہ وہ کس حیثیت میں مجیب الرحمان سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔

علی نے کہا ان کے مجیب الرحمان سے ذاتی مراسم ہیں اور وہ ذاتی حیثیت میں اُسے ملنے آئے ہیں۔ بریگیڈیر علی سے شناسا تھا۔ وہ اس کے علاقے میں اس کی حیثیت اور کام سے آگاہ تھا۔ اس نے فوراً قصر صدارت رابطہ کر کے علی کی ریسٹ ہاوس آمد اور قصد ملاقات کی اطلاع دی تو قصر صدارت کے ذرائع نے اُنہیں ملاقات کی کلیرنس دے دی لیکن ساتھ ہی مطلع کر دیا کہ وہ مجیب سے کوئی ڈیل بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر انہوں نے کوئی ڈیل بنائی تو حکومت اُسے آنر نہیں کرے گی۔

مجیب الرحمان نے علی اور زرینہ کو ریسٹ ہاوس میں اپنے کمرے کی طرف آتے دیکھا تھا کھڑے ہو کر ان کی طرف باہیں پھیلا دیں۔ اُس وقت بھی وہ اپنے مخصوص سفید پجامے کرتے اور سیاہ کرتی میں ملبوس تھا۔ اور کندھوں پر پنجابی اسٹائل میں چادر لپیٹ رکھی تھی۔

مجیب الرحمان کو اس حالت میں دیکھ کر علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجیب الرحمان اور علی دونوں ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے نگاہوں سے ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہے۔ نہ مجیب نے کچھ کہا نہ علی نے۔ زرینہ اور چوہدری فیض خاموشی سے پاس کھڑے ان کو دیکھتے رہے۔

آخر مجیب نے کہا رات بھٹو آیا تھا۔ کہتا تھا اگر میں اسے اقتدار میں شریک کر لوں تو وہ اب بھی جرنیلوں کو سمجھا بجھا کر چیزوں کو سیدھے راستے پر ڈال سکتا ہے۔

" تو آپ نے اسے کیا جواب دیا؟" علی نے پوچھا۔

"میں نے کہا اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ یحیی خان نے تمہارے کہنے پر بنگال میں جو کچھ کر دیا ہے اس کی وجہ سے چیزیں اب میرے ہاتھ سے نکل گئی ہیں۔" مجیب نے جواب دیا۔

"اِس پر بھٹو کا ردِ عمل کیا تھا۔"

"وہ چڑ گیا تھا۔ ناراض ہوا تھا۔ کہہ رہا تھا میں نے اپنی ہٹ دھرمی سے حالات کو یہاں تک پہنچایا ہے۔"

علی نے دیکھا مجیب کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اس نے چادر کے پلو سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا اور پھر بولا:

"یہ سب خود غرض ہیں۔ یحییٰ خان، بھٹو، اور مغربی پاکستان کے باقی لیڈران، سب پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔ ہم مشرقی بنگال والے ضرور چاہتے ہیں کہ ہمیں صوبائی خود مختاری ملے۔ لیکن ہم پاکستان قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سب مشرقی بنگال کو بوجھ سمجھتے ہیں اور پاکستان سے کاٹ پھینکنا چاہتے ہیں۔" مجیب نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"کوئی راستہ؟ کوئی حل؟ امید کی کوئی کرن؟" علی نے پوچھا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مشرقی بنگال کے لیڈروں نے مغربی بنگال جا کر جلاوطن حکومت قائم کر لی ہے۔ اگر میں نے سرِ مُو اُن کے نقطہ نظر سے انحراف کیا تو میری کوئی نہیں سنے گا۔"

علی کو یقین تھا کہ مجیب الرحمان سچ بول رہا تھا۔ اب حالات جو نہج اختیار کر چکے تھے ان کو دوبارہ صحیح وسالم پاکستان کی طرف لے جانا ممکن نہیں تھا۔

ملاقات ختم کرنے سے پہلے اُس نے مجیب الرحمان سے پُوچھا کہ اگر وہ اُس کے لیے کچھ کر سکے تو اُسے خوشی ہو گی۔

مجیب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

علی، زرینہ اور چوہدری فیض نے مجیب کا شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر بادل ناخواستہ وہاں سے رُخصت ہوئے کہ وہ کوشش کریں گے کہ اُس کے احوال سے مطلع رہیں۔

فصل 44

مشرقی پاکستان میں ملٹری آپریشن جاری تھا۔بنگالی عوام اور فوج میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ عوام وہ کر رہے تھے جو وہ مناسب جانتے تھے اور فوج وہ کر رہی تھی جو ایسے حالات سے دوچار ہر فوج کرتی ہے۔

اگر بنگالی چاہتے تھے کہ انہیں قومی وسائل میں ان کا جائز حق دیا جائے تو اس مطالبے میں کیا برائی تھی۔

اگر بنگالی پاکستانی تھے تو ان کے ساتھ پاکستانیوں جیسا سلوک ہونا چاہیے تھا۔

لیکن پاکستان میں کچھ لوگ، خاص طور پر جو اقتدار پر قابض تھے، خود کو نائب اللہ فی الارض سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ محض اقتدار پر قابض ہونا اُنہیں اس بات کا حق عطا کرتا ہے کہ وہ عوام کے ساتھ جو چاہیں جیسا چاہیں سلوک روا رکھیں۔

لیکن ایسی ذہنیت رکھنے والے انسان بھول جاتے ہیں کہ اگر ان کا ظاہری لباس اتار دیا جائے تو فطری لباس میں وہ بھی انہی لوگوں جیسے ہوتے ہیں جن پر وہ طرح طرح کے ظلم توڑتے ہیں۔

فطری لباس میں نہ کوئی مولوی ہوتا ہے، نہ کوئی دانشور اور نہ کوئی مزدور۔ نہ کوئی حاکم ہوتا ہے نہ محکوم۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ شہنشاہ ایران اگر دس اور ایرانیوں کے ساتھ فطری لباس میں کھڑا ہو جائے تو اس میں اور باقی دس عام ایرانیوں میں سارے امتیازات ختم ہو جائیں۔

مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کرنے والوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ سمجھتے تھے وہ شہنشاہ ہیں اور بنگالی عوام ان کے عوام ہیں۔ لہذا وہ جیسا چاہیں اُن کے ساتھ سلوک روا رکھیں اُنہیں کوئی پوچھنے والا نہیں؟

علی نے محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ انتخابی مہم کے دوران واضح طور پر دیکھ لیا تھا کہ بنگالی عوام اب فیصلہ کن مرحلے تک آ پہنچے تھے۔

وہ قومی معاملات کو قومی انداز میں چلانا چاہتے تھے۔ لیکن اسلام آباد ابھی تک "تصور قوم" کے کسی مفروضے سے بہت دور تھا۔ علی کو مجیب الرحمان کے الزام میں سچائی دکھائی دیتی تھی کہ اسلام آباد میں حکمران قوتیں مشرقی پاکستان کو پاکستان کے وجود سے کاٹ پھینکنا چاہتی ہیں۔

مجیب الرحمان کے بیان سے علی پریشان تھا۔ اُسے دیوار پر مشرقی پاکستان کی علحدگی کی تحریر واضح طور پر لکھی دکھائی دینے لگی تھی۔

کیا پاکستان صرف مغربی پاکستان ہے۔ اور مشرقی پاکستان پاکستان نہیں ہے؟ کیا مشرقی پاکستان کی علحدگی کے بعد بھی مغربی پاکستان پاکستان رہے گا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن جائے گا؟

اگر یہ سلسلہ یہاں نہیں رکتا تو کیا کل بلوچستان اور سندھ علحدگی اختیار کر لیں گے تو پاکستان صرف پنجاب اور سرحد تک محدود رہ جائے گا؟ اور اگر کسی وقت سرحد والے بھی فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ پنجاب کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو کیا پاکستان پنجاب تک محدود ہو جائے گا؟ اس صورت میں پنجابی کیا پنجاب کو پاکستان کہیں گے یا پاکستان کے لفظ کو ترک کر کے مغربی پنجاب یا صرف پنجاب کا نام اپنا لیں گے؟

کیا یہی سب کچھ تھا جس کے لیے برصغیر کے طول و عرض میں پھیلے غریب مسلمانوں نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا؟

جیسے جیسے مشرقی پاکستان سے خانہ جنگی کی خبریں ملتیں علی کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہو جاتا۔ پھر اسے مغربی پاکستان میں اس ساری لڑائی میں لوگوں کے رویئے کا بہت دکھ تھا۔

لوگ جس طرح کی باتیں کرتے تھے اور مشرقی پاکستان اور بنگالیوں کے بارے میں جو بیانات دیتے تھے اس سے علی کے دل پر چھریاں چل جاتی تھیں۔

زرینہ اسے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی تو وہ کہتا: "زری جان یہ کتنے احمق لوگ ہیں۔ ذاتی زندگیوں میں تو یہ چاہتے ہیں کہ اگر ان کا ایک گھر لاہور میں ہو تو دوسرا مری میں اور تیسرا کراچی میں لیکن قومی زندگی میں یہ مشرقی پاکستان اور بنگالیوں کے بارے میں ایسی بیہودہ گفتگو کرتے ہیں؟ یہ نہیں

جانتے کہ مشرقی پاکستان کی کتنی اہمیت ہے؟ یہ اتنے بد ذوق لوگ ہیں کہ یہ مشرقی پاکستان کے فطرتی حسن کی قدرافزائی کی حس سے بھی محروم ہیں۔ اور کچھ نہیں تو جالب کے ان اشعار سے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ پھر اس نے تصرف لفظی کرتے ہوئے جالب کے یہ اشعار پڑھے۔

"محبت گولیوں سے بو رہے ہیں
وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہیں
گماں ان کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہیں"

لیکن شاعروں کے وجدان کو ہوس پرست لوگ کیا جانیں۔ ان کے سر پر مشرقی پاکستان کے قتل کا بھوت سوار ہے یہ اسے قتل کر کے دم لیں گے۔ یہ بھٹو، یہ یحیٰی خان، یہ جنرل فرمان علی، یہ جنرل ٹکا، یہ جنرل نیازی یہ سب مشرقی پاکستان کے قاتل ہیں۔"

زرینہ علی کو اس حال میں دیکھتی تو وہ بھی اپنے ہوش وحواس کھونے لگتی۔

اور پھر کہتی: "علی جان تم نے کہا تھا کہ ہم محترمہ کی مہم کے بعد مشرقی پاکستان واپس جائیں گے۔ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ میں مشرقی پاکستان کو خون میں تر بہ تر ہونے سے پہلے دیکھنا چاہتی تھی۔ میں کاکس بازار جانا چاہتی تھی۔ میں رنگامٹی میں وقت گزارنا چاہتی تھی لیکن تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ میں تمہیں کبھی اس کے لیے معاف نہیں کروں گی۔"

علی پاگلوں کی طرح اسے اپنے سینے میں بھینچ لیتا اور تسلی دیتا:

"ہم ضرور جائیں گے مشرقی پاکستان۔ مشرقی پاکستان ہمارا ملک ہے۔ بنگالی ہمارے بھائی ہیں۔ وہ خود غرض بھٹو اور چند گمراہ جرنیلوں کی وجہ سے ہم سے جدا نہیں ہوں گے۔"

"لیکن علی جو کچھ وہاں ہو رہا ہے اس کے بعد مجھے نہیں لگتا کہ بنگالی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ میں نے تمہارے ساتھ سہالہ میں شیخ مجیب الرحمان کی آنکھوں میں آتش اور نراش کے جو دو رنگ دیکھے ہیں

مجھے ان میں پاکستان کا انجام اور بنگلہ دیش کی پیدائش واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے۔"

علی شکار کر زرینہ کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دیتا۔ وہ حقیقت جانتے ہوئے بھی حقیقت کا سامنا کرنے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں پا رہا تھا۔

آج کل اس کی وہی حالت تھی جو 1965 کی جنگ کے دنوں میں تھی۔ جیبی ٹرانسسٹر ہر وقت ساتھ رکھتا۔ تاکہ ریڈیو پاکستان، آکاش وانی اور بی بی سی سے خبریں سن سکے۔

بی بی سی کی خبریں تو وہ روزانہ رات کے وقت اپنے دوستوں کے ہمراہ سنتا۔ زرینہ کے علاوہ صفدر شاہ، سلیم موٹا اور اظہر رات کے کھانے کے بعد اکٹھے بی بی سی کی خبریں سنتے اور پھر ان خبروں پر تبصرہ کرتے۔ ریڈیو پاکستان اور آکاش وانی کی خبروں کا بی بی سی کی خبروں سے موازنہ کرتے۔

آج کل ان کے دوستوں میں کئی اور دوستوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی بی بی سی کی خبریں سننے ان کے ہاں چلے آتے۔ اور پھر دیر تک خبروں کے حوالے سے بحث مباحثہ کرتے۔ ان نئے دوستوں میں لارڈ نذیر ملہی بھی شامل تھے۔ جن کی علی کے باپ دادا سے شناسائی تھی اور جو قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

ان نئے دوستوں کی وجہ سے چوہدری فیض بھی باقاعدگی کے ساتھ علی کے ہاں آنے لگے تھے۔ وہ بھی مشرقی پاکستان کے حالات پر خاصے پریشان تھے۔ ان کا بھی خیال تھا کہ اب مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے ساتھ اکٹھا نہیں رہے گا۔

ان سب دوستوں میں مشترکہ چیز مشرقی پاکستان میں جاری ملٹری آپریشن سے ناگواری تھی۔ جیسے جیسے وہاں حالات خراب ہو رہے تھے یہ ناگواری اذیت میں بدل رہی تھی۔

اس اذیت کا ایک بہت بڑا سبب ان کی بے بسی کی کیفیت تھی۔ جس سے وہ سب دوچار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کیا ہونے جا رہا ہے لیکن نہیں جانتے تھے کہ اس کو ہونے سے کیسے روکا جائے۔ پاکستان کو کیسے بچایا جائے۔

لارڈ نذیر ملہی خاصے دلچسپ آدمی تھے۔ چوہدری فیض، علی، زرینہ اور ان کے دوست دلچسپی سے ان کی باتیں سنتے۔ لارڈ نذیر ملہی کو شراب پینے کی عادت تھی۔

جب سے وہ مشرقی پاکستان کی روز بروز خراب ہوتی صورت حال کی بی بی سی کی شام کی خبریں سننے کے لیے آنے لگے تھے علی نے ان کی پسندیدہ شراب منگوا رکھی تھی۔

چونکہ علی کے دوستوں میں سے کوئی اور شراب نہیں پیتا تھا وہ لارڈ ملہی خود ہی اپنا جام تیار کرتے اور پھر آہستہ آہستہ پیتے رہتے۔

جیسے جیسے شراب ان کے جسم میں اترتی ان کے چہرے پر چمک آنے لگتی۔ وہ محبت سے قائدِاعظم کی داستانیں سناتے۔ ایسے میں علی کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔

علی لارڈ نذیر ملہی سے پوچھتا کہ وہ پاکستان کے ایام تخلیق اور موجودہ دنوں میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔ لارڈ نذیر ملہی افسردہ لہجے میں کہتے کہ تب ہمارے خواب زندہ تھے۔ لیکن گزشتہ بیس پچیس سالوں میں جو کچھ پاکستان بننے کے بعد ہوا ہے لگتا ہے ہمارا سب سفر رائیگاں گیا ہے۔ اور اب جو ہو رہا ہے اور ہونے جا رہا ہے اس سے تو ہم نے عزت کے ساتھ جینے کا حق کھو دیا ہے۔ اگر جئیں گے تو شرمندگی کے ساتھ۔

"کیسی شرمندگی اور کس سے شرمندگی۔؟" زرینہ پوچھتی۔

"شرمندگی اپنے آپ سے۔ اپنے اُن ساتھیوں سے جن کے ساتھ مل کر ہم نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا۔ ان سے جنہوں نے ہمارے ساتھ مل کر پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی۔ شرمندگی اپنے قائد سے جس نے پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن ہم اتنے چھوٹے نکلے کہ ہم نے اس ملک کو اپنی خواہشوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔" لارڈ ملہی کی آواز رُندھ جاتی۔

"لارڈ صاحب یہ بتائیں اب ہونے کیا جا رہا ہے؟" چوہدری فیض پوچھتے۔

"اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی کی پوری تیاری کر لی ہے۔ اسلامی دنیا اور یورپی برادری کو اس نے اعتماد میں لے لیا ہے۔ روس اور امریکہ بھی اس کے ہمنوا بن چکے ہیں۔ وہ جلدی مشرقی پاکستان

پر فوج کشی کرے گی۔ شاید مناسب لمحے کا انتظار کر رہی ہے۔" وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنا تجزیہ پیش کرتے۔

چند دنوں بعد اندرا گاندھی نے واقعتاً مشرقی پاکستان پر فوج کشی کر دی۔ ہر روز پاکستان اور باقی دنیا کے ریڈیو اسٹیشنوں کی خبروں میں فرق نمایاں ہونے لگا۔

ریڈیو پاکستان مختلف محاذوں پر کامیابی کی خبریں سناتا جبکہ آکاش وانی ریڈیو تہران، اور بی بی سی سے مشرقی پاکستان میں پاکستان کے نقصانات کی خبریں ملتیں۔

ایک دن بی بی سی کی خبریں سننے کے بعد سب بہت اُداس اور ڈیپریس تھے۔ لگتا تھا اب چند دن کا کھیل رہ گیا ہے۔ لارڈ نذیر ملہی نے گہرے دکھی انداز میں کہا کہ: "اب تو اس ملک میں شراب پینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ علی، زرینہ اور چوہدری فیض بھی خاموش تھے اور دکھ کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

سلیم موٹے نے اپنا بربط اٹھایا اور حسب عادت راگ الاپنا شروع کر دیا۔ آج اس کی آواز میں بھی عجیب سا دکھ بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کہاں سے اس نے ایرانی شاعر رھی معیری کی غزل حاصل کی تھی۔ جسے وہ دکھ بھری آواز میں گا رہا تھا:

آن قدر با آتش دل ساختم تا سوختم
بی تو ای آرام جاں یا ساختم یا سوختم
سرد مھری بین کہ کس بر آتشم آبی نزد
گرچہ ہمچوں برق از گرمی سراپا سوختم
سوختم امانہ چون شمع طرب در بین جمع
لالہ ام کز داغ تنہائی بہ صحرا سوختم
ہمچو آن شمعی کہ افروزند پیش آفتاب
سوختم در پیش مہ رویاں و بیجا سوختم

سوختم از آتش دل در میان موج اشک
شور بختی بیں کہ در آغوش دریا سوختم
شمع و گل ہم ہر کدام از شعلہ ای در آتشند
در میان پاکبازاں من نہ تنہا سوختم
جان پاک من رھی خورشید عالمتاب بود
رفتم و از ماتم خود عالمی را سوختم

رھی معیری

سلیم موٹا گا رہا تھا۔ علی اور زرینہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہے تھے۔ لارڈ نذیر ملہی نے شراب کا جام زمین پر پھینک کر یہ کہتے ہوئے توڑ دیا کہ اب وہ کبھی شراب نہیں پئیں گے۔

فصل 45

پندرہ اور سولہ دسمبر کی درمیانی رات علی اور زرینہ بی بی سی سے خبریں سننے کے بعد کافی دیر تک مشرقی پاکستان کی دگرگوں صورت حال پر گفتگو کرتے رہے۔

چوہدری فیض اور لارڈ نذیر ملہی کا خیال تھا کہ ہندوستان کی فوجیں پہلے سے ڈھاکہ میں داخل ہو چکی ہیں اور اب وہاں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مصروف ہیں۔

علی ابھی تک ریڈیو پاکستان کی خبروں کی صداقت پر ان سے بحث کر رہا تھا۔ دل کی گہرائیوں میں اسے اندازہ تھا کہ چوہدری فیض اور لارڈ نذیر ملہی ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن وہ خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کے ہندوستان کے قبضے میں چلے جانے کی حقیقت تسلیم کرے۔ وہ سب سے کہہ رہا تھا بھٹو نے 1965 میں کشمیر میں جس گوریلا کاروائی کا آغاز کیا تھا آج پاکستان اپنے خون سے اس کی قیمت ادا کر رہا ہے۔

1965 کی جنگ میں تو یو این او کی سرکردگی میں سوویت یونین نے سیز فائر کروا دیا تھا اور پھر ویسے بھی ہندوستان نے چند سال پہلے چین کے ہاتھوں جنگ میں شکست کی ہزیمت اٹھائی تھی جس کی وجہ سے ان کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا تھا لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

اُنھوں نے گزشتہ چھ سات سال میں چین کے ساتھ 1962 اور بعد میں پاکستان میں 1965 کی جنگ کے اثرات سے خود کو صاف کر لیا تھا اور اب پاکستان کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں جنگ کو حتمی شکل دینے کی پوزیشن میں تھے۔

ہندوستان کی فوجی قیادت کے برعکس پاکستان کی فوجی قیادت کی سیاست میں مداخلت کی وجہ سے ترجیحات تبدیل ہو چکی تھیں۔ اب وہ فوجی کم اور سیاست دان زیادہ تھے۔ ترجیحات کی اسی تبدیلی کے نتائج اُنہیں

مشرقی پاکستان میں بھگتنے پڑ رہے تھے۔ اس کے علاوہ بنگالی ویسے بھی فوج کی اقتدار کی گیموں سے تنگ آ چکے تھے۔ ملٹری ایکشن کے بعد بنگالی پاکستانی فوج کے ساتھ ایک قابض فوج کی طرح لڑ رہے تھے۔ علی کا خیال تھا ان فیکٹرز کی وجہ سے فوج کا ہندوستانی فوج کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں جیتنا ناممکن تھا۔ سب کو علی کی بات سے اتفاق تھا۔

اس طرح کی گپ شپ کے بعد سب رُخصت ہوئے تو علی اور زرینہ خواب گاہ میں جا کر لیٹ گئے۔ زرینہ تو لیٹتے ہی سو گئی لیکن علی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں جنگ اُس کے ذہن پر اِس طرح مسلط تھی کہ اُسے سونے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

کافی دیر بعد اس کی آنکھ لگی تو اس نے خواب دیکھا کہ وہ کسی کھلے میدان میں کھڑا ہے۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا ہے۔ پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ آسمان سے خون کی بارش ہونے لگی ہے۔ اور ہر چیز خون میں تربتر ہو گئی ہے۔

سارے درخت، گھر، پانی کے تالاب، کھیت اور کھیتوں میں کھڑی فصلیں خون میں نہا گئی ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے اور ایک ٹکڑا مشرق اور دوسرا مغرب کی طرف گر گیا ہے۔

اِس کی بعد اُس کی آنکھ کھل گئی۔ سردی کے باوجود اس کا وجود پسینے سے شرابور تھا۔ اُس پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری تھی۔

چند لمحوں بعد اُس کے حواس بجا ہوئے تو اُسے اندازہ ہوا کہ مشرقی پاکستان ختم ہو گیا ہے۔ اس نے بصد مشکل اپنی آہوں کو روکا اور زرینہ کو بستر میں سوتے چھوڑ کر حویلی کے اُس کمرے میں چلا گیا جہاں قائداعظم آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ جہاں اب بھی ان کی قدِ آدم تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔

وہ قائداعظم کی تصویر کے سامنے کھڑا ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "بابا ہمیں معاف کر دینا۔ ہم نے ہر طرح سے کوشش کی لیکن ہم پاکستان کو نہیں بچا سکے۔ وہ قوتیں جو اِسے توڑنا چاہتی تھیں بہت طاقت ور تھیں اور ہم بہت کمزور تھے۔

کاش ہم میں اتنی قوت ہوتی کہ ہم اُنہیں پاکستان توڑنے سے رُوک سکتے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکے۔ ہم پاکستان کو نہیں بچا سکے۔ مشرقی پاکستان پاکستان کی روح تھا۔ مشرقی پاکستان باقی نہیں رہا تو پاکستان کی روح ختم ہو گئی ہے۔ باقی جو کچھ بچ گیا ہے یہ پاکستان نہیں کچھ اور ہے۔ اور جو لوگ ہیں یہ بھلے خود کو پاکستانی کہتے رہیں۔ لیکن یہ پاکستانی نہیں کچھ اور ہیں۔"

زرینہ کی آنکھ کھلی تو علی کو بستر پر نہ پا کر پریشان ہو گئی۔ اسے قائد اعظم کے کمرے سے علی کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی مشرقی پاکستان کا سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا ہے۔ اس نے کمرے میں ہلکی روشنی کا بلب بھی بجھا دیا اور وہ بھی تاریکی میں ہلکی ہلکی سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگی۔

ختم شد

کچھ مصنف کے بارے میں

خواجہ اشرف 1951 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پہلے مختصر عرصہ کے لیے اسلام آباد میں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ میں کام کیا۔ پھر پنجاب پبلک سروس کمشن سے انتخاب کے بعد پنجاب میں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور پنجاب کے مختلف کالجوں میں بطور لیکچرار پڑھاتے رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دورانِ تعلیم پاکستان کے مختلف اخبارات میں کے ایم اشرف کے نام سے سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

پاکستان میں وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین اوراق اور ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین شب خون میں کئی کہانیاں اور انشایئے لکھے۔

جنرل ضیا الحق کے مارشل لاء کے بعد 1981 میں امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں یونیورسٹی آف فنکس سے ایم بی اے کرنے کے بعد کاروباری دنیا سے وابستگی اختیار کی۔

امریکہ منتقلی کے بعد ضیا دور میں مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد مشرف دور میں بھی جاری رہی۔ اب بھی پاکستان میں جمہوریت کی نشوونما اور ترویج واشاعت سے خاص دلچسپی ہے۔

ادب میں ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ ہے۔ زیر نظر نثری نظموں کے مجموعے کے علاوہ وہ تین ناولوں 'مٹی کا بیٹا' ،'نسل سوختہ' اور 'شب گزیدہ سحر' کے اور کہانیوں کے دو مجموعوں 'آئینہ کہانی' اور 'مکالمے کا قتل' کے مصنف ہیں۔ تاحال لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

مصنف کی دیگر کتابیں

مٹی کا بیٹا۔۔۔ناول

ایک اچھوتی اور دلچسپ کہانی جو پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہو کر امریکہ سے ہوتی ہوئی اسی گاؤں میں ختم ہوتی ہے۔ کہانی کا ہیرو ساری عمر اپنے طبعی والد کی تلاش میں کئی دلچسپ مرحلوں سے گزرتا ہے۔ انسانی جذبوں کی عظیم داستان جو انسان دوستی اور انسانی مساوات کا درس دیتی ہے۔ تشدد اور جنگ سے بچنے کا سبق سکھاتی ہے۔ زندگی کے احترام کی تلقین کرتی ہے۔

نسلِ سوختہ۔۔ناول

1947 میں پاکستان بننے سے لیکر 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کے پاکستان ٹوٹنے کی کہانی۔ پاکستانی سیاست کی بائیبل جس میں اُن کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی وجہ سے 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان دولخت ہُوا۔ پاکستان کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے ممکنہ حل پیش کرتی ہے۔ پاکستانی سیاست میں دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شخص کے لئے اس ناول کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اس کا مطالعہ اُنہیں پاکستان کو ایک نئے پس منظر میں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شب گزیدہ سحر۔۔ناول

شب گزیدہ سحر روسی انقلاب کے بعد سوویت یونین کی تشکیل سے لے کر تحلیل تک کی کہانی ہے جو ایک رومانی داستان کے ذریعے نہ صرف انقلاب کی کہانی سناتی ہے بلکہ سوویت یونین کے عروج وزوال اور آخرِکار تحلیل کے پس پردہ عوامل اور کرداروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ناول اپنے قارئین کو سوویت

یونین کے بارے میں ایک نیا پسِ منظر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر انقلابی کارکن اس ناول کو پڑھ کر انقلاب کے لئے اپنی جدوجہد میں ممکنہ غلطیوں سے خود کو اور تحریک کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

آئینہ کہانی۔۔۔ کہانیوں کا مجموعہ

آئینہ کہانی میں مصنف کے قلم سے لکھی گئی چھبیس انوکھی اور دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر کہانی زندگی کے کسی نہ کسی انوکھے رُخ کی نشاندہی کرتی ہے جسے پڑھ کر انسان بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مکالمے کا قتل۔۔۔ کہانیوں کا مجموعہ

پاکستانی معاشرے کے بکھرتے ہوئے تارپود اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی اور معاشی ہجرتوں کے تناظر میں بنتی اور مٹتی کہانیاں۔ اردو ادب میں نئے رجحانات اور امکانات کی آئینہ دار۔ انوکھی اور اچھوتی کہانیاں۔

برف میں کِھلا پھُول۔۔۔ حسیّاتی نظمیں

احساسات کی لفظوں میں تصویر کشی کے بہترین شاہپارے۔ اردو شاعری میں جدید لسانی اور تصوراتی رجحانات کی عمدہ ترین کتاب۔

کتاب خریدنے کے لیے مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کریں:

Email: kashraf@ix.netcom.com